ایمان بالقدر

پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری

ادارہ منہاج القرآن
مرکزی سیکرٹریٹ ۳۶۵-ایم ماڈل ٹاؤن
لاہور - (پاکستان)
۸۶۷۱۲۲ - ۴۲ - ۹۲

Marfat.com

ایمان بالقدر

پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری

ادارہ منہاج القرآن
مرکزی سیکرٹریٹ ۳۶۵، ایم ماڈل ٹاؤن ٥ لاہور (پاکستان)
فون ۸۶۷۱۲۲ — ۴۲ —— ۹۲

Marfat.com

جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں

نام کتاب ——— ایمان بالقدر

خطبات ——— پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری

ترتیب و تدوین ——— ضیاء نیّر ۔ جاوید القادری

اشاعت اوّل ——— جنوری ۱۹۸۹ء

تعداد ——— ۲ ہزار

قیمت ——— ۱۲/- روپے

مطبع ——— طبع فی المطبعة العربية
۳۰۔ ایبک روڈ، بالمقابل مفتی چیمبر، پرانی انارکلی، لاہور۔ پاکستان

نوٹ :۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری صاحب کی تمام تصانیف اور خطبات و تقاریر کے ریکارڈ شدہ کیسٹوں سے حاصل ہونے والی جملہ آمدنی ان کی طرف سے ہمیشہ کیلئے ادارہ منہاج القرآن کیلئے وقف ہے۔

ناظم نشر و اشاعت

Marfat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مَوْلَایَ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا

عَلٰی حَبِیْبِکَ خَیْرِ الْخَلْقِ کُلِّهِمِ

مُحَمَّدٌ سَیِّدُ الْکَوْنَیْنِ وَالثَّقَلَیْنِ

وَالْفَرِیْقَیْنِ مِنْ عُرْبٍ وَّمِنْ عَجَمِ

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم

Marfat.com

گورنمنٹ آف پنجاب کے نوٹیفکیشن نمبر ایس او (پی۔۱۰) ۴-۱/۸۰ ۔ پی آئی ڈی مورخہ ۳۱ جولائی ۸۴ء
گورنمنٹ آف بلوچستان کی چٹھی نمبر ۸۔۴۔۲۰ ای جنرل وایم ۴/۹۰-۳، مورخہ ۲۶ دسمبر ۱۹۸۷ء
اور شمال مغربی سرحدی صوبہ کی حکومت کی چٹھی نمبر ۱۱۴۴۲-۷۶ ۔ این ۔ ۱/اے-ڈی (لائبریری) مورخہ ۳۰ اگست ۸۶ء
کے تحت پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی تصنیف کردہ کتب ان صوبوں میں تمام کالجوں اور سکولوں کی لائبریریوں کے لئے
منظور شدہ ہیں

Marfat.com

فہرست مضامین

صفحہ	عنوانات	نمبر شمار
	ایمان بالقدر	
۱۰	خلق عمل اور کسب عمل میں فرق	
۱۴	کیا مخلوق کے لیے دیکھا جانا ضروری ہے	
۱۵	جزا و سزا کا تعلق کسب سے ہے نہ کہ خلق سے	
۱۸	ایک غلط فہمی اور اس کا جواب	
۲۰	انسان کے مختار یا مجبور ہونے کا مسئلہ	
۲۰	حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد	
۲۱	بین القدر والجبر کا مفہوم	
	عمل انسانی کے تکمیلی مراحل	
۲۱	فرض اور خواہش میں کشمکش کا مرحلہ	
۲۲	غور و خوض کا مرحلہ	
۲۲	انتخاب نیت کا مرحلہ	
۲۳	عزم و ارادے کا مرحلہ	
۲۳	تعمیل کا مرحلہ	
۲۴	نتیجۂ عمل کا مرحلہ	

Marfat.com

قدر و جبر اور تصورِ عدل ۲۹

اللہ تعالیٰ کا تصورِ عدل ۳۲

عدل کا مقام رفیع — احسان ۳۴

خداوند تعالیٰ کی احسان پسندی ۳۶

خدا تعالیٰ اگر بندے کو مجبور کرنا چاہے تو اسے کوئی روک نہیں سکتا ۳۷

جزا اور سزا اور نظام عدل ۳۷

جزا و سزا اور اتمام حجت ۳۸

اتمام حجت کا مفہوم ۴۱

اخلاقی جدوجہد ۴۲

حالت اضطرار اور قانونِ اسلامی ۴۵

سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا ارشاد ۴۷

سلطنتِ اسلامیہ کا فرض ۴۷

سیدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک مقدمہ ۴۸

ایک صحابی کا سوال اور حضور علیہ السلام کا جواب ۴۹

قضا و قدر کا انسانی زندگی میں کردار ۵۱

قدر کا مفہوم ۵۲

عوامی غلط فہمی اور اس کا ازالہ ۵۵

Marfat.com

صفحہ	عنوانات	نمبرشمار
۵۶	قضا اور قدر کی دو اصطلاحیں اور ان کا مفہوم	
۵۶	قضا و قدر آفاقی و کائناتی اعتبار سے	
۵۷	انسانی زندگی میں قدر کا مفہوم	
۵۹	قضا کا مفہوم	
۶۰	سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد	
۶۱	حق کی پکار جاری رہتی ہے	
۶۲	بیمار شخص کے لیے مرغن خوراک	
۶۳	قدر مقدم، قضا مؤخر	
۶۴	موسمی حالات کی پیشین گوئی	
۶۵	پیشین گوئیوں کا پس منظر	
۶۹	قضا معلق و قضا مبرم	
۷۰	حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد	
۷۱	سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد	

Marfat.com

Marfat.com

○

ایمانیات کے سلسلے کا ایک اہم ترین موضوع "ایمان بالقدر"[1] ہے۔ جو اجزائے ایمان میں سے آخری، مگر انتہائی مہتم بالشان جزو ہے۔ لیکن عجیب اتفاق ہے کہ اسی مسئلہ کی نسبت لوگوں کے ذہنوں میں طرح طرح کے شکوک وشبہات اور اوہام و وساوس پائے جاتے ہیں، نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس موضوع پر کرید کرید کر گفتگو سے منع فرمایا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ شیطان تم میں سے

---

[1] "القدر" قدر یقدر (قدیرًا) سے مصدر ہے، جس کے لغوی معنی اندازہ لگانے، پیدا کرنے، لکھنے یا توانا ہونے کے ہیں، لیکن اصطلاحِ شریعت میں اس سے مراد خداوند تعالیٰ کا وہ ذاتی ارادہ ہے، جو مختلف حقائقِ کائنات کے تعلق میں اپنے اپنے مقررہ اوقات پر ظاہر ہوتا ہے۔
(دستور العلماء ۳، ۴۰، مطبوعہ حیدرآباد دکن)

خداوند تعالیٰ کے ہاں ہر چیز کے بے پناہ خزانے ہیں، مگر ان خزانوں کو ایک خاص اندازے سے نازل کیا جاتا ہے، ارشادِ باری ہے:

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (الحجر ۱۵: ۲۱)

ہر چیز کے ہمارے پاس بے شمار خزانے ہیں، مگر ہم انہیں ایک مقررہ اندازے سے ہی نازل کرتے ہیں۔

اسی مسئلے کا نام مسئلہ تقدیر یا مسئلہ قضا و قدر ہے۔

Marfat.com

کسی ایک کے پاس آتا ہے اور پوچھتا ہے کہ تجھے کس نے پیدا کیا، فلاں چیز کو کس نے پیدا کیا، یہاں تک کہ وہ پوچھتا ہے کہ خدا کو کس نے پیدا کیا، آپؐ نے فرمایا کہ بس یہاں رک جاؤ، شیطان کے شر سے خدا کی پناہ مانگو۔ اس سے آگے نہ سوچو۔ [1] مقصد یہ تھا کہ لوگ اس پیچیدہ اور نازک مسئلے میں خوامخواہ الجھ کر اپنی عاقبت نہ خراب کر بیٹھیں۔ کیونکہ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ انسانی عقل و دانش اس نازک مسئلے کے حقیقی مضمرات کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ لہٰذا اس موضوع پر بحث و تمحیص ایک حد سے آگے بڑھنے کا نتیجہ گمراہی ہی ہو سکتا ہے۔

اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ "انسان کے مجبور یا مختار" ہونے کا مسئلہ صرف مذہبی فلسفے کا ہی موضوع بحث نہیں رہا، بلکہ یہ دنیا بھر کے فلاسفہ، مفکرین اور علماء کا محبوب ترین موضوع رہا ہے۔ نفسیات، جرمیات، عمرانیات اور دیگر مختلف فلسفوں میں اس مسئلے پر سیر حاصل مباحث ملتے ہیں۔ جنہیں مسلم اور غیر مسلم مفکرین اور فلسفیوں نے اپنے اپنے فکر اور اپنے اپنے علم سے فروغ بخشا ہے۔ پھر یہ ہر زبان کے ادب اور شاعری کا بھی موضوع رہا ہے، اس بنا پر اس مسئلے میں قسم قسم کی آرا ملتی ہیں، اسی لیے اس کے اثرات خواص سے لے کر عوام تک کے ذہنوں کو متاثر کرنے میں اہم کردار انجام دیتے ہیں۔

(الف) خلقِ عمل اور کسبِ عمل میں فرق

اس سلسلے میں قرآن کریم تقدیر کے جس کلیے پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے، اس کا ماحصل یہ ہے کہ انسان اور اس کے جملہ اعمال کو اللہ تعالیٰ نے

---

[1] بخاری و مسلم، نیز مشکوٰۃ شریف، ۱ : ۳۰۔

Marfat.com

تخلیق کیا ہے، چنانچہ ارشادِ باری ہے:

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ؎ — حالانکہ تم کو اور تمہارے اعمال کو خدا نے ہی پیدا کیا ہے۔

اس آیت میں انسان اور اس کے اعمال دونوں کی تخلیق کو خداوند تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ مگر یاد رہے کہ تخلیق اور کسب دو مختلف المعانی اور مختلف المقاصد الفاظ ہیں، کسب (اسی سے اکتساب بروزن افتعال ہے) کے معنی کرنے یا کمانے کے ہیں۔ جبکہ خلق اور تخلیق کے معنی کوئی چیز پیدا کرنے اور وجود میں لانے کے ہیں۔ انسان اپنے افعال کا مکتسب (یعنی کمانے اور کرنے والا) ہے، مگر ان کا خالق اللہ تبارک وتعالیٰ ہے۔ انسان اور اس کی تمامتر اشیا و اعمال مخلوقِ محض ہیں، جبکہ خداوند تعالیٰ دنیا کی ہر چیز کے خالق و باری ہیں۔ اس طرح اس کائنات میں فقط دو تصوّرات رہ جاتے ہیں، اول خداوند تعالیٰ کے خالق ہونے کا تصوّر، اور دوم انسان اور اس کے جملہ افعال کے مخلوق ہونے کا تصور۔ خالق ہر فعل میں خالق ہے اور مخلوق اپنی ہر صفت میں مخلوق۔

خدا اور اس کی ذات وصفات کے سوا چونکہ کائنات کی ہر ادنیٰ و اعلیٰ چیز مخلوق ہے، اس لیے کائنات اور اس میں وقوع پذیر ہونے والے اعمال و افعال بھی مخلوق ہیں، جن کی من حیث المخلوق، تخلیق تو باری تعالیٰ نے کی ہے، مگر کسب وارتکاب انسان اپنی رضا و رغبت سے کرتا ہے۔ اس لیے اب اس سوال کا جواب کہ انسان کی اپنے افعال کی طرف کیا نسبت ہوگی۔ قرآن کریم یہ واضح کرتا ہے کہ انسان اپنے افعال کا خالق نہیں، بلکہ کاسب، مکتسب اور مرتکب ہے۔ ارشاد

؎ الصّٰفّٰت (۳۷ : ۹۶)

Marfat.com

فرمایا گیا:

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ [1]

ہاں جو برے کام کرے اور اس کے گناہ ہر طرف سے اس کو گھیر لیں تو ایسے لوگ دوزخ میں جانے والے ہیں اور وہ ہمیشہ ہمیشہ اس میں جلتے رہیں گے۔

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ [2]

اگر اس نے نیک کام کیے (یعنی اعمال کمائے) تو اسی کو فائدہ پہنچے گا اور اگر برے کام کیے (یعنی اعمال کمائے) تو اسی کو اس کا نقصان اٹھانا پڑے گا۔

جس طرح کائنات کی ہر چیز خدا کی مخلوق ہے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ بڑی ہے یا چھوٹی، انسان ہے یا حیوان، جن ہے یا فرشتہ، سیارہ ہے ستارہ، زمین ہے یا کوئی اور خطہ، سمندر ہے یا خشکی، جمادات میں سے ہے یا حیوانات سے، مادہ ہے یا توانائی، کوئی خارجی وجود ہے یا ذہنی تصور، کوئی عملی حقیقت ہے یا فکری تخلیق، ہر چیز اپنے وجود میں خدا تعالیٰ کی صفت خلاقیت و صناعی کی آئینہ دار اور اپنے ہونے اور باقی رہنے میں اسی کی محتاج ہے اور اس کا خالق صرف اللہ ہے، اسی طرح انسان جو بھی عمل کرتا ہے، مثلاً اس کا گفتگو کرنا، اس کا آرام کرنا، اس کا کھیلنا کودنا، اس کا حوائج ضرور یہ کی تکمیل کرنا، اس کا اٹھنا بیٹھنا، اس کا چلنا پھرنا، آنا جانا، اس کا ہر کام اپنے وجود میں ایک فعل اور عمل ہے۔ اور ہر فعل ایک وجود ہونے کے

---

[1] البقرہ (۲ : ۸۱)

[2] البقرہ (۲ : ۲۸۶)

Marfat.com

اعتبار سے خدائی مخلوق ہے۔ کیونکہ فعل بھی انسان ہی کی طرح انفس و آفاق پر مشتمل اسی کائنات کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ لیکن اکتساب کی ذمہ داری کے اعتبار سے اس فعل کو انسان کا فعل کہیں گے خدا کا نہیں۔ چنانچہ اس کی نسبت بہرحال انسان کی طرف ہی ہوگی، جیسے کہ مذکورہ بالا آیت میں الفاظ "وَمَا تَعْمَلُوْنَ" (اور جو تم عمل کرتے ہو) میں فعل کے انجام دینے کی ذمہ داری انسان پر عاید کی گئی ہے۔ گویا عمل ایک ہے، مگر اس کے پہلو دو ہیں، ایک پہلو کے اعتبار سے وہ خدا تعالیٰ کی مخلوق ہے اور دوسرے کے اعتبار سے انسان کا مکسوب۔ اس تصور کو سمجھنے کے لیے بچے کے تخلیق کے عمل ہی کو لیجیے: ہر شخص جانتا ہے کہ بچہ محض مرد و عورت کے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جانے ہی سے پیدا نہیں ہو جاتا، بلکہ اس کی پیدائش کے لیے "امر ایزدی" کی بھی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ کتنے ہی جوڑے ایسے ہیں کہ برسہا برس گزر جانے کے باوجود ان کے دامن بچوں کی نعمت سے محروم رہتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بچے کی تخلیق میں بنیادی عمل دخل "رشتۂ ازدواج" کا ہی ہوتا ہے۔ گویا کسبًا تو بچے کو وجود والدین کے دم قدم سے ملا، لیکن خلقًا یہ خدا تعالیٰ کی عطا کا رہینِ منت ہے۔ [1]

---

[1] اسی لیے قرآن کریم میں ایسے "جوڑوں" کو ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے کہ جو اولاد کی نعمت کو اپنی طرف یا کسی اور سفلی ذریعے کی طرف منسوب کرتے ہیں، ارشاد ہے:

فَلَمَّآ اٰتٰهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰهُمَا ۚ فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (الاعراف، ۷: ۱۹۰)

پس جب خدا تعالیٰ نے ان کو صحیح و سالم بچہ عطا کر دیا تو وہ اس کے خلق میں شریک ٹھہرانے لگے، حالانکہ اللہ تعالیٰ شریک کیے جانے سے بلند و بالا ہے۔

حالانکہ اولاد کی نعمت عطا کرنا، یا اس سے محروم رکھنا اور اسی طرح دیگر انسانی حاجات کی تکمیل کرنا خالصتًا اللہ رب العزت کا فعل ہے۔

Marfat.com

اسی طرح ہر انسانی عمل اپنے کسب میں انسانی ہاتھوں کا محتاج ہے، مگر اپنے وجود اور اپنی ہستی میں خدا تعالیٰ کے حکم "کن" کا دست نگر ہے۔

کیا مخلوق ہونے کے لیے دیکھا جانا ضروری ہے؟

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ انسانی عمل دیکھنے میں تو انسان ہی کی تخلیق محسوس ہوتا ہے اسے انسانی کسب سے الگ ایک مخلوق کس طرح مان لیا جائے۔ اس لیے سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ہر مخلوق کے لیے الگ طور قابل دید ہونا بھی ضروری ہے؟ یا نہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ ہر مخلوق بحیثیت ایک مخلوق کے، ہر ایک کے لیے مرئی نہیں ہوا کرتی۔ قرآن کریم میں قسم کھا کر یہ کہا گیا ہے:

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ۝ قسم ہے ان چیزوں کی جن کو تم دیکھتے

وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ [۱] ہو اور جن کو تم نہیں دیکھ سکتے۔

سائنس بھی اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ دنیا میں بہت سی اشیاء موجود ہونے کے باوجود نظر نہیں آسکتیں، مثلاً اس کمرے میں ٹنوں کے حساب سے ہوا موجود ہے۔ مگر یہ ہوا انسانی آنکھ یا خوردبین کے ذریعے نہیں دیکھی جا سکتی۔ اسی طرح انسانی آواز مخلوق ہے، اگر تھوڑی دیر کے لیے کان بند کر لیے جائیں تو آنکھوں اور دوسرے حواس کی مدد سے اس کا ادراک نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ کسی چیز کا مرئی ہونا (یعنی دکھائی دینا) اس وقت ضروری ہے، جبکہ اس کا طبعی وجود کثیف ہو اور دوم یہ کہ اس کو محسوس اور معلوم کرنے والی خاص حس اپنی صحیح حالت میں ہو۔ جو اشیاء غیر حسی ہوں یا ان کو محسوس کرنے والے حواس میں نقص ہو تو ایسی صورت میں کوئی چیز خارج میں پائے جانے کے باوجود محسوس نہیں کی جا سکتی۔

خود انسان حسی اور کثیف وجود رکھتا ہے اس لیے اس کا موجود ہونا آنکھوں سے

Marfat.com

دیکھا جا سکتا ہے، مگر اس کا عمل بذاتِ خود ایک لطیف وجود ہے، لہذا اس کے اثرات و نتائج کا تو ہم مشاہدہ کرتے ہیں اور اس کے ارتکاب میں استعمال ہونے والے اعضاء کو تو ہم دیکھ سکتے ہیں مگر ان اعضاء و جوارح اور اثرات و نتائج سے قطع نظر فی نفسہٖ عمل کے وجود کو محسوس نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی مثال بالکل ایسے ہے کہ رحم اور محبت حقیقت میں اپنا اپنا وجود تو رکھتے ہیں۔ لیکن جب تک انہیں آپ ماں کی ممتا، باپ کی شفقت اور دوست کے اخلاص کے روپ میں نہ دیکھیں، ان کا وجود از خود دکھائی نہیں دے سکتا۔ یعنی انہیں دیکھنے کے لیے کسی رحم دل شخص کے عمل اور کسی محبت کرنے والے کے التفات کا سامنے ہونا ضروری ہے۔ اگر یہ انسانی یا حیوانی ظرف نہ ہوں تو رحم، غصہ، محبت، نفرت، بخل، حرص اور تکبر وغیرہ جیسے اوصاف دکھائی نہیں دے سکتے۔ گویا اوصاف کے وجود کا انکار ممکن نہیں۔ لیکن ان کے ظہور کے لیے کسی مظہر کا ہونا ضروری ہے۔ ان کے پائے جانے کا انکار ممکن نہیں مگر انہیں سمجھنے کے لیے کوئی ذریعہ چاہیے۔ جو شے خود ایک لطیف یا غیر حسی وجود رکھتی ہو اسے معلوم کرنے کے لیے اس کا اتصال کسی حسی اور کثیف حقیقت سے ہونا ضروری ہے۔ جیسے جان جسم کے بغیر دکھائی نہیں دیتی، اسی طرح عمل، کسی عامل کی شکل میں دکھائی دیتا ہے۔ اس کے بغیر نہیں۔ لہذا عامل کو، عمل کا خالق نہیں بلکہ اس کا کاسب تصور کیا جائے گا۔ کیونکہ اس نے عمل کو فی نفسہٖ پیدا نہیں کیا بلکہ اسے کر کے دکھایا ہے۔

جزا و سزا کا تعلق کسب سے ہے نہ کہ خلق سے

قرآن کریم یہ حقیقت بھی پوری طرح واضح کر دیتا ہے کہ اگرچہ ہر انسانی عمل تخلیق کے اعتبار سے تو مخلوقِ خدا ہے، لیکن صدور اور ظہور کے اعتبار سے انسان کا کسب ہے اور کسب و ارتکاب چونکہ آزادانہ ہے

Marfat.com

اس لیے وہی اپنے عمل کے انجام کا ذمہ دار ہے کیونکہ جزا و سزا کا تعلق کسب اعمال سے ہوتا ہے نہ کہ خلق اعمال سے۔ اسی بنا پر سورۂ الملک میں انسانی تخلیق کا مقصد واضح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا:

اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ	اس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا، تاکہ
وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ	تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں سے کون
اَحْسَنُ عَمَلًا [1]	اچھے عمل کرتا ہے۔

موت و حیات بھی اپنی تخلیق کے اعتبار سے، خدا تعالیٰ کی مخلوق ہیں، مگر اپنے واقع ہونے کی مناسبت سے، ان کا وجود کسی نہ کسی سبب کا رہینِ منت ہے۔ اسی طرح اعمال بھی تخلیق کے اعتبار سے مخلوقِ باری تعالیٰ ہیں، لیکن ان کا وجود میں آنا انسان کا رہینِ منت ہے۔ زندگی، اعمال کے ارتکاب کا سبب بنتی ہے اور موت عالم آخرت میں ان کے نتائج کے مشاہدے کا۔ دنیا میں موت و حیات کی تخلیق کی غرض و غایت بھی یہی ہے کہ یہ دیکھا جا سکے کہ کون اچھے اعمال اپناتا ہے اور کون بُرے۔ اسی تصور کو قرآن کریم دوسری جگہ واضح کرتا ہے:

وَمَآ اَصَابَکُمْ مِّنْ	اور جو مصیبت تم پر نازل ہوتی ہے
مُّصِیْبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتْ	سو وہ تمہارے اعمال ہی کا نتیجہ ہوتی ہے۔
اَیْدِیْکُمْ [2]	

---

[1] الملک (۶۷: ۲)

[2] الشوریٰ (۴۲: ۳۰)

ایک دوسری جگہ اسی حقیقت کو یوں بیان کیا گیا ہے:

(باقی آئندہ صفحے پر)

Marfat.com

یعنی انسان دنیا میں جن نقصانات، مشکلات اور آزمائشوں سے دوچار ہوتا ہے وہ سب اس کے اپنے اعمال کے نتائج و ثمرات ہیں۔

یہ تو انفرادی شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والی مصیبتوں کا ذکر تھا، دوسری جگہ اجتماعی زندگی کی مشکلات کو بھی لوگوں کے اپنے اعمال کے نتائج قرار دیا گیا۔ ارشاد فرمایا گیا:

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُم بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا[1]

خشکی اور تری میں لوگوں کے اپنے اعمال کے سبب سے فساد پھیل گیا ہے تاکہ وہ لوگوں کو ان کے بعض اعمال کا بدلہ چکھائے۔

اس دنیا میں نیکی یا بدی کا خلقی وجود گو من جانب اللہ ہے، مگر اس میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ ان کے کسب کی ذمہ داری ان کے خالق پر عائد نہیں ہوتی

(از صفحۂ گزشتہ)

مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ وَمَا أَصَابَكَ مِن سَيِّئَةٍ فَمِن نَّفْسِكَ

تمہیں جو اچھائی پہنچتی ہے وہ خدا کی طرف سے پہنچتی ہے اور جو برائی پہنچتی ہے وہ تمہاری اپنی طرف سے ہے۔

(النساء ۴: ۷۹)

گویا نعمت کے حصول میں تو خدا تعالیٰ کا لطف و کرم شامل ہوتا ہے، مگر مصیبت کے وقوع میں خالصتاً انسان کی اپنی غلطیوں کا عمل دخل ہوتا ہے، اگرچہ ہر اچھائی اور برائی کی خلقت ہوتی من جانب اللہ ہے۔ لیکن ادب بندگی یہی ہے جس کی اوپر تعلیم دی جا رہی ہے۔

[1] الروم (۳۰: ۴۱)

Marfat.com

اس لیے کہ اللہ کا فعل مطلقاً خلق ہے نہ کہ کسب و ارتکاب۔ خلق کا مقصد یہ تھا کہ انسان کو اچھائی اور برائی میں تمیز کا شعور اور اختیار بخشا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ انسان عمل کے کس پہلو کو اختیار کرتا ہے۔ پھر ہر عمل کی تخلیق کے ساتھ ساتھ ہدایت ربانی کے ذریعے اس عمل کے نتائج و عواقب سے بھی انسان کو باخبر کر دیا جاتا ہے ان تمام باتوں کے باوجود اگر کوئی شخص اپنی مرضی سے فتنہ و شر اور بدی کا راستہ اختیار کرے تو وہ اپنے اعمال کی جزا و سزا کا ذمہ دار کیوں نہ ٹھہرایا جائے؟۔

ایک غلط فہمی اور اس کا جواب

اس تفصیل سے یہ مسئلہ اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ انسان سے اگر مواخذہ ہوتا ہے تو اس لیے کہ وہ بقائمی ہوش و حواس، اپنی مرضی اور اپنے ارادہ و اختیار سے کسی عمل کا ارتکاب کرتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا بے سود ہے کہ جب ہر عمل کا خالق اللہ تعالیٰ ہے تو انسان کو کیوں لائقِ تعزیر گردانا جاتا ہے؟ انسان کو بلا وجہ نہیں پکڑا جاتا، اس کی گرفت اس کے کسب و اختیار کا نتیجہ ہوتی ہے۔[۱]

---

[۱] یہی غلط فہمی مشرکینِ مکہ میں بھی موجود تھی، چنانچہ وہ کہا کرتے تھے:

لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ (الانعام۔ ۶، ۱۴۸)	اگر خدا تعالیٰ چاہتا تو ہم اور ہمارے باپ دادا اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتے اور کسی چیز کو اپنی مرضی سے حرام نہ ٹھہرا سکتے۔

مگر اس کے جواب میں ان سے کہا گیا کہ محض برائی کا وجود اس کے جائز ہونے کا ثبوت نہیں ہو سکتا، برائی اور اچھائی تو ازل سے موجود ہے۔ اور اسی غرض کے لیے ہے کہ اکتساب کے حوالے سے لوگوں میں اچھے اور بُرے کا امتیاز پیدا ہو سکے۔

Marfat.com

خدائی فعل "خلق" کی حقیقت تو فقط اتنی ہے کہ اس نے اپنی دوسری بہت سی مخلوقات کی طرح انسانی اعمال کو بھی تخلیق کیا اور انسان کو بھی پیدا کر کے اسے اختیار دے دیا کہ وہ جس قسم کے اعمال چاہے اپنے لیے منتخب کرے۔ اس لیے انسان اپنے اختیار سے اعمال کا جو چناؤ کرے گا اور جس قسم کے اعمال کو اپنے کسب و ارتکاب کے لیے مختص کرے گا وہ اسی طرح کی جزا یا سزا کا مستوجب ہو گا۔ اگر غور کیا جائے تو صاف نظر آجاتا ہے کہ اس پوری کائنات میں ذمہ داریوں کا نظام بھی کسب پر ہی چل رہا ہے نہ کہ خلق پر۔

خدا تعالیٰ نے ہر چیز کی ضد پیدا کی ہے، دن کے ساتھ رات۔ آرام کے ساتھ بے آرامی، راحت کے ساتھ تکلیف، خیر کے ساتھ شر، حق کے ساتھ باطل، صدق کے ساتھ کذب، رحم کے ساتھ ظلم، نیکی کے ساتھ بدی اور جنت کے ساتھ دوزخ۔ اب محض ایک چیز کا موجود ہونا اس کے اپنانے کی ذمہ داری سے برأت کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ اگر خدا تعالیٰ نے سائے کے ساتھ دھوپ کو پیدا کیا تو اس لیے نہیں کہ کوئی سخت گرمی میں دھوپ میں جا بیٹھے اور کسی تکلیف کے واقع ہو جانے کے بعد، وہ یہ کہے کہ میری تکلیف کا باعث خدا تعالیٰ کا دھوپ کو پیدا کرنا ہے؟ اس صورت میں اس کے اس قول پر کون شخص یقین کرے گا؟ اُلٹا ہر کوئی اسی کو کہے گا کہ خدا تعالیٰ نے دھوپ اور سائے کی تخلیق تو اس لیے فرمائی تھی کہ انسان کو گرمیوں میں سائے اور سردیوں میں دھوپ دونوں کی راحت میسر آسکے۔ دھوپ کی تخلیق کا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ کوئی شخص بلا مقصد برہنہ سر یا برہنہ پا چلچلاتی دھوپ میں چلے پھرے اور خواہ مخواہ کسی تکلیف سے دوچار ہو جائے اگر خود انسان نے اس کا استعمال غلط طریقے پر کیا تو اس سے تخلیق کا کیا قصور ثابت ہوا۔

Marfat.com

(ب) انسان کے مختار یا مجبور ہونے کا مسئلہ

مسئلہ تقدیر کے ضمن میں ایک مسئلہ انسان کے مجبور یا مختار ہونے کا بھی ہے کہ آیا انسان کو مکمل طور پر مختار سمجھا جائے یا مجبور محض۔ لہ

اس ضمن میں حقیقت بالکل واضح ہے کہ انسان نہ تو کلیتہً ایسا مختار ہے کہ اس پر کوئی قدغن ہی نہ ہو اور نہ ہی ایسا مجبور کہ وہ خود کو ہر ذمہ داری سے بری قرار دے سکے۔ انسان کی حقیقی حیثیت "بین القدر والجبر" ہے جو ایک معتدل کیفیت سے عبارت ہے۔ فی الواقع اسے اختیار وارادے کی مکمل آزادی ہے لیکن اس کی آزادی میں نہ افراط ہے نہ تفریط۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد منقول ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کسی نے اس مسئلے کی بابت استفسار کیا تو آپ نے سائل سے فرمایا کہ اپنی ایک ٹانگ اوپر اٹھاؤ۔ اس نے اٹھائی، پھر فرمایا کہ اب دوسری بھی اٹھاؤ۔ اس نے عرض کیا: یہ تو ناممکن ہے، فرمایا کہ پہلی حد انسان کے اختیار کی تھی اور دوسری حد اس کی مجبوری کی ہے۔ یعنی اس کا اپنا توازن اسے اختیار کی ایک خاص حد سے آگے گزرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

لہ تاریخ اسلام میں ایسے متعدد فرقوں کا ذکر ملتا ہے، جن میں سے بعض کا یہ خیال تھا کہ انسان مکمل طور پر مجبور ہے، اور وہ ایک تنکے کو بھی اپنی مرضی سے ہلانے کا اختیار نہیں رکھتا، جب کہ ان کے بالمقابل بعض ایسے لوگ بھی تھے جو انسان کو مکمل طور پر آزاد اور خود مختار قرار دیتے تھے۔ حالانکہ قرآن وسنت کی روشنی میں جو حقیقت سامنے آتی ہے وہ "بین القدر والجبر" ہے۔

Marfat.com

بین القدر والجبر کا مفہوم

بین القدر والجبر کے تصور کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ان مراحل کو سمجھا جائے جن سے گزر کر کوئی عمل تکمیل پذیر ہوتا ہے۔

۱۔ فرض اور خواہش میں کش مکش کا مرحلہ

سب سے پہلے انسان کے دل میں کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے سے متعلق ایک کش مکش پیدا ہوتی ہے یعنی اسکا فرض اور اسکی آرزو بیک وقت اس کے سامنے آتے ہیں اور پھر وہ اس احساس سے دوچار ہوتا ہے کہ یہ کام کرے یا نہ کرے۔

یہاں یہ امر پیش نظر رہے کہ یہ احساس صرف شعوری اور اختیاری اعمال سے متعلق ہوتا ہے۔ جو اعمال غیر شعوری اور غیر اختیاری طور پر صادر ہوتے ہیں۔ اور جنہیں اضطراری اعمال کہا جاتا ہے، ان کا ان مراحل سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی ایسے افعال پر گرفت ہوتی ہے۔ عملاً اس کی مثال یوں سمجھیے کہ اگر کوئی شخص آپ کی آنکھ میں سوئی چبھونا چاہے اور اس کے خوف سے آپ کی پلکیں اضطراری طور پر بند ہو جائیں۔ تو یہ ایک اضطراری فعل ہے اور ایسا فعل قابل مواخذہ نہیں، لیکن اگر یہی پلکیں بدنیتی سے کسی فعل ناحق کے لیے حرکت کریں، تو یہ اختیاری اور ارادی فعل ہوگا اور اس پر گرفت ہوگی۔ حرکت ایک ہی ہے مگر ارادے اور نیت نے اسے کچھ سے کچھ بنا دیا۔

بہرحال اولاً ذہن میں ایک کشمکش سی پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً کسی کا مال دیکھ کر اسے ناجائز طور پر ہتھیانے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اور دوسری طرف خدا کے حکم نہی کا بھی خیال آگیا۔ نتیجۃً دونوں خیالات ابھرے اور ذہن میں ایک کشمکش سی شروع ہوگئی۔ اسی لیے اس ابتدائی سوچ کے مرحلے کو کشمکش کا مرحلہ کہا

Marfat.com

گیا ہے۔

۲ غور و خوض کا مرحلہ اس کے بعد غور و خوض کا مرحلہ شروع ہو جاتا ہے، ذہن دونوں چیزوں کے ممکنہ نتائج یعنی فوائد و نقصانات کا جائزہ لیتا ہے، وہ خلائی حکم پر بھی نظر ڈالتا ہے اور دنیوی منافع پر بھی اس طرح فعل کا ذہنی وجود کشمکش کے ابتدائی مرحلے سے گزر کر غور و خوض کے مرحلے میں داخل ہو جاتا ہے کشمکش اور غور و خوض کے دونوں مرحلوں پر انسانی ذہن کسی قسم کی مجبوری یا پابندی (COERSION & COMPULSION) کا شکار نہیں ہوتا۔ یہ دونوں عمل ذہن اور شعور کی سطح پر آزادانہ طریقے سے واقع ہوتے ہیں۔

۳۔ انتخاب نیت کا مرحلہ اس کے بعد اگلا مرحلہ ذہنی فیصلے کا ہوتا ہے یہاں پہنچ کر انسان دو راستوں میں سے ایک کا انتخاب کرتا ہے۔ اور پوری سوچ بچار کے بعد اسے یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ وہ اچھائی کا مرتکب ہو یا برائی کا، صحیح راستے پر گامزن ہو یا غلط پر، امر فرض کی پیروی کرے یا خواہش نفس کی، اسی ذہنی فیصلے کو "انتخاب نیت" کہتے ہیں۔ یہاں تک انسان اپنے ذہنی عمل سے گزرتا ہے، آپ ٹھنڈے دل سے سوچ کر بتائیے کہ کیا ان تینوں مرحلوں میں کسی اعلیٰ قوت نے انسان کو مجبور کیا؟ اسے خواہش کو اختیار کرنے یا فرض پورا کرنے کے درمیان غور و خوض پر کسی طرف سے خارجی دباؤ پڑا؟ ہرگز نہیں، یہ تو خالصتاً ذہنی قلبی اور داخلی عمل تھا۔ آپ نے مسئلے کے ہر پہلو کو اچھی طرح سے دیکھا اور پرکھا، ایک کشمکش اور ذہنی تصادم کے مرحلے سے گزر کر سوچ بچار کے نتیجے میں ذہنی فیصلے کے مرحلے تک پہنچے۔ یہاں تک عمل مکمل طور پر آزاد ہے۔

Marfat.com

۴۔ عزم وارادے کا مرحلہ

اس کے بعد عزم وارادے کا مرحلہ آتا ہے۔ جہاں پہنچ کر آپ اپنے ذہنی فیصلے یعنی نیت کو واقعہ بنانے اور اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے ذہنی طور پر کمربستہ ہوجاتے ہیں یہاں نیت اور ارادے میں فرق پیشِ نظر رہے کہ نیت، ذہنی سطح پر کسی چیز کو منتخب کرنے اور ارادہ اس نیت کی تکمیل پر ذہن کے کمربستہ ہوجانے کا نام ہے۔ گویا ارادہ، نیت کے انتخاب سے جنم لیتا ہے، نیت مقدم ہوتی ہے اور ارادہ موٴخر، لہذا ارادہ ہمیشہ نیت کے تابع ہوتا ہے۔

۵۔ تعمیل کا مرحلہ

اس کے بعد پانچواں مرحلہ ارادے کی تعمیل کا آتا ہے۔ جہاں پہنچ کر انسان عملی قدم اُٹھاتا ہے۔ عملی تدبیر کے لیے سرگرم ہوجاتا ہے۔ اگر آپ نے بالفرض کسی دشمن کو مارنے کا ارادہ کرلیا ہے تو آپ کے عمل کا پانچواں مرحلہ کسی ہتھیار کے ساتھ اس پر حملہ کرنا ہوگا۔ لہذا تعمیل ہمیشہ ارادے کے تابع ہوتی ہے۔

۶۔ نتیجۂ عمل کا مرحلہ

جب ارادے کی تکمیل ہوچکی تو اب اس عمل کے نتیجے کے برآمد ہونے کا مرحلہ آتا ہے۔ مثلاً ہتھیار استعمال کرنے سے وہ شخص مرجائے یا زخمی ہوجائے گا۔ یہ نتیجہ آپ کے مرحلۂ تعمیل کے تابع ہے جبکہ مرحلۂ تعمیل خود عزم وارادے کے تابع ہے۔ اور انتخابِ نیت کا مرحلہ خود کسی شے کے تابع نہیں، کیونکہ وہ محض غوروخوض کے نتیجے میں وجود میں آیا تھا۔

یہ ہیں چھ مراحل جن سے کوئی عمل گزر کر اپنے نتیجے کے مرحلے تک پہنچتا ہے بتائیے ان مراحل میں سے وہ کون سا مرحلہ ہے جہاں آپ پر کوئی خارجی دباؤ موجود تھا؟ ذہنی کش مکش سے لے کر نتیجۂ عمل تک آپ خود بخود آگے بڑھتے چلے گئے

Marfat.com

اسی اقدام کا نام "کسبِ عمل" ہے۔

بالفاظِ دیگر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عمل کے چھ مرحلے دو حصوں میں منقسم ہیں۔ پہلا حصہ ذہنی کشمکش سے شروع ہو کر انتخابِ نیت کا تھا، جبکہ دوسرا ارادے سے شروع ہو کر نتیجۂ عمل تک محیط تھا۔ ان میں سے پہلے حصے میں آدمی خود مختار اور آزاد ہوتا ہے، لیکن دوسرے حصے میں خود اپنے انتخابِ نیت کا پابند۔ لیکن یہ مجبوری کیسی؟ خود اپنی سوچ اور نیت کی مجبوری۔ اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

انما الاعمال بالنیات[1] — اعمال کا دار و مدار نیت پر ہے۔

مزید فرمایا:

ان اللہ لا ینظر الی صورکم و اموالکم ولکن ینظر الی قلوبکم و اعمالکم[2] — بلاشبہ خدا تعالیٰ تمہاری شکلوں اور مالوں کو نہیں دیکھتے بلکہ تمہارے اعمال اور دلوں کو دیکھتے ہیں۔

گویا خدا تعالیٰ کے ہاں عمل کی ذمہ داری کا فیصلہ انسان کی نیت اور اس کے ارادے کے مطابق ہوتا ہے۔ جیسی نیت ہوگی ویسی ہی نوعیتِ عمل ہوگی۔ اسی بنا پر قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا:

وَمَنْ يَخْرُجْ مِنْ بَيْتِهِ مُهَاجِرًا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ يُدْرِكْهُ — اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی رضا کی نیت سے اپنے گھر بار سے ہجرت کے لیے نکلے پھر رستے میں اسے موت آ لے

---

[1] البخاری، حدیث اول۔

[2] المسلم جلد ۲، ص ۳۱۷۔

Marfat.com

الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؎ تو اللہ تعالیٰ پر اس کا اجر ثابت ہو گیا۔ (یعنی اسے پورے عمل کی جزا عطا کی جائے گی)

کیونکہ خدا کی ذات یہ نہیں دیکھتی کہ اس کا یہ عمل اپنے انجام تک پہنچا یا نہیں؟ بلکہ یہ دیکھتی ہے کہ اکتساب عمل میں اس کی نیت کیا تھی۔

قرآن و حدیث میں اسی بنا پر نیت کے اخلاص اور اس کی درستگی پر زور دیا گیا ہے اور اسی پر ہی تمام فوائد و ثمرات مرتب ہوتے ہیں۔ نیت سے ہی ایک شخص مخلص مسلمان اور نیت سے ہی ایک شخص منافق سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ زبان اور ظاہر کی حد تک قول دونوں کا ایک ہی ہوتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ انسان اچھائی یا برائی کے ارتکاب کے لیے جب اپنی نیت کا انتخاب کرتا ہے اس وقت وہ مکمل طور پر باشعور اور با اختیار ہوتا ہے۔ اسے دونوں راستوں میں سے کسی بھی راہ کو اپنانے کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ مرحلہ خالصتاً اس کے اپنے ذہنی فیصلے کا ہوتا ہے۔ اسی آزادی کی بنا پر وہ "شخص" "با اختیار" تصور کیا جاتا ہے۔ اور اس کے اسی اختیار کے باعث اس سے جواب طلبی اور مؤاخذہ بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ بقیہ تمام مراحل عمل اس کی آزادانہ منتخب شدہ نیت کے تابع ہوتے ہیں۔ رہا خارجی مجبوریوں اور حالات کی پریشانیوں کا دباؤ، تو اس کا اثر نیت کے مرحلے پر نہیں بلکہ عزم و ارادے کے مرحلے (چوتھے مرحلے) پر ہوتا ہے۔ کیونکہ عزم و ارادہ اصولی طور پر تو انتخاب نیت کے تابع ہوتا ہے لیکن کسی مجبوری کے باعث یہ ارادہ۔ نیت (ذہنی طلب اور قلبی فیصلے) کے خلاف بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی دل تو کچھ اور چاہتا ہو لیکن کسی مجبوری کے تحت ارادہ کسی اور کام

؎ النساء (۴: ۱۰۰)

Marfat.com

کا کرنا پڑے۔ گویا ذہن کسی کام کو نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا ارادہ کرنے پر مجبور ہو۔ اگر ایسی صورت حال ہو تو یہ فعل "جبر و اکراہ" کہلاتا ہے۔ اور جبر و اکراہ حالت اضطرار (EXTREME NECESSITY) تک پہنچ جائے تو انسان سے اخلاقی و قانونی ذمہ داری اور جوابدہی مرتفع ہو جاتی ہے۔ خدا کی ذات صحیح معنوں میں مجبور شخص کو سزا نہیں دیتی۔ لہذا یہ حالت "استثنیٰ" (EXCEMPTION) کی ہو گئی مگر اصول و کلیہ وہی رہا کہ ہر شخص اپنے آزادانہ انتخاب نیت کے باعث پابند جزا و سزا ہے۔

اس موضوع پر عقائدِ اسلامی کی کتاب شرح "عقائد النسفی" میں بڑی سیر حاصل بحث کی گئی ہے، اس بحث کے چند ضروری مقامات حسب ذیل ہیں۔ علامہ تفتازانی فرماتے ہیں:

وللعباد افعال اختیاریۃ یثابون بہا ان کانت طاعۃ ویعاقبون علیہا ان کانت معصیۃ لا کما زعمت الجبریۃ انہ لا فعل للعبد اصلاً وان حرکاتہ بمنزلۃ حرکات الجمادات لا قدرۃ علیہا ولا قصد ولا اختیار وھذا باطل لانا نفرق بالضرورۃ بین حرکۃ

اور بندوں کو اپنے افعال کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ اس بنا پر اگر یہ افعال طاعت پر مبنی ہوں تو ان کا ثواب ملتا ہے اور اگر معصیت ہوں تو ان پر عذاب دیا جاتا ہے۔ فرقہ جبریہ کا یہ کہنا غلط ہے کہ بندے کو اپنے افعال کا کچھ اختیار ہی نہیں اس کی حرکات و سکنات تو محض جمادات کی حرکات کے مشابہ ہیں، جنہیں اپنے افعال پر نہ قدرت حاصل ہوتی ہے اور نہ قصد و اختیار، جس کی وجہ یہ ہے کہ اگر بندے کو اپنے افعال کا اختیار ہی نہیں تو اس کا

Marfat.com

البطش وحركة الارتعاش
ونعلم ان الاول باختياره
دون الثاني ولانه لو لم
يكن للعبد فعل اصلاً
لما صح تكليفه، ولا
يترتب استحقاق الثواب
والعقاب على افعاله ولا
اسناد الافعال التي تقتضي
سابقية القصد والاختيار
اليه على سبيل الحقيقة
مثل صلّى وكتب وصام
بخلاف مثل طال الغلام و
اسود لونه۔ ان الله
خالق والعبد كاسب و
تحقيقه ان صرف العبد
قدرته وارادته الى
الفعل كسب و ايجاد الله
تعالى الفعل عقيب ذلك
خلق والمقدور الواحد
داخل تحت قدرتين
لكن بجهتين مختلفتين

احکامِ الٰہی کا مکلف ٹھہرایا جانا اور اس کا
ثواب و عذاب کا مستحق ہونا، نیز افعال کا
اس کی طرف منسوب ہونا کس طرح درست
ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ان افعال میں حرکت سے
پہلے قصد اور اختیار ہوتا ہے۔ اسی بنا پر یہ
کہا جاتا ہے کہ اس نے نماز پڑھی، اس نے
لکھا جو اشیاء اس کی قدرت سے باہر ہیں
ان کے متعلق انداز مختلف ہوتا ہے۔ مثلاً
کہا جاتا ہے کہ اس نے روزہ رکھا جبکہ
لڑکا بڑا ہو گیا اس کا چہرہ سیاہ پڑ
گیا، افعال کی نسبت بندے کی
طرف نہیں کی جاتی۔ بلا شبہ اللہ تعالیٰ
خالق ہیں اور بندہ اعمال کا کاسب ہے
اور تحقیق اس کی اس طرح ہے کہ بندہ
اس کام میں اپنی قدرت اور صلاحیت
صرف کرتا ہے، لہٰذا یہ کسب ہے اور
خدا تعالیٰ اس کی کوشش کے بعد اس فعل
کو موجود کر دیتا ہے یہ خلق ہے، ایک
ہی فعل دو قدرتوں سے وجود میں آتا ہے
لیکن دو مختلف جہتوں سے فعل اپنے وجود
کے اعتبار سے خدا کا فعل ہے۔ مگر

Marfat.com

فالفعل مقدور الله تعالیٰ بجهة الایجاد و مقدور العبد بجهة الکسب کالارض تکون ملکا للہ تعالیٰ بجهة التخلیق وللعباد بجهة ثبوت التصرف [1]	اپنے کسب کے اعتبار سے بندے کا جس طرح زمین تخلیق کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے اور ثبوت تصرف کے اعتبار سے بندے اس کے مالک ہیں۔

علامہ تفتازانی کی اس بحث سے یہ مسئلہ اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ اگرچہ ہر چیز خدا تعالیٰ کے فعل خلق کے نتیجے میں وقوع پذیر ہوتی ہے۔ لیکن عملی طور پر بندہ اپنے افعال میں کسب کا اختیار رکھتا ہے اور اسی اختیار کی بنیاد پر اپنے ہر عمل کا ذمہ دار اور اس پر جزا و سزا کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔

---

[1] شرح عقائد النسفی، ص ۶۴ — ۶۶ مطبع علیمی لاہور

Marfat.com

جبر و قدر
اور
تصوّرِ عدل

Marfat.com

Marfat.com

○

انسان کے مجبور یا مختار ہونے، نیز انسان کے "اپنے افعال کے کاسب ہونے" پر گزشتہ باب میں تفصیل سے اظہارِ خیال کیا جا چکا ہے اس تمام بحث سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ انسان اپنے افعال کا کاسب ہے۔ مگر خالق خداوند تعالیٰ کی ذات ہے۔ نیز یہ کہ انسان کو کسبِ اعمال میں اختیار اور ارادے کی آزادی بھی حاصل ہے۔

اس بحث سے ایک نیا مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کو اللہ ربُّ العزت کی طرف سے اختیار کی جو دولت عطا کی گئی ہے، اس کا پس منظر اور سبب کیا ہے۔ انسان کو آخر مختار کیوں بنایا گیا؟ قرآن مجید میں اس سلسلے میں ایک جامع ارشاد ہے:۔

اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ[1] تم جو چاہو کرتے رہو، وہ (اللہ) تمھارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔

اس آیۂ مبارکہ کے تین الفاظ پر اگر غور کیا جائے تو مسئلہ تقدیر کے تمام ممکنہ پہلو سامنے آ جاتے ہیں، اور اس بارے میں پیدا ہونے والے تمام شکوک و شبہات رفع ہو جاتے ہیں۔

۱۔ **اِعْمَلُوْا: تم عمل کرو:** لفظ اِعْمَلُوْا میں عمل کی نسبت انسان کی طرف کی گئی ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انسان اپنے افعال کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں

---

[1] حٰمٓ السجدہ (۴۱: ۴۰)

Marfat.com

نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ وہ اپنے افعال کے کسب میں مختار ہے۔ اچھے یا بُرے عمل کرنے کی آزادی رکھتا ہے۔ وہ جس قسم کے اعمال چاہے کرے اور جس قسم کے اعمال سے چاہے، احتراز کرے۔ اِس پر قدرت کی طرف سے کوئی دباؤ نہیں ڈالا جاتا۔

۲۔ مَاشِئْتُمْ: (جو تم چاہو) "اِعْمَلُوْا" کے لفظ سے عملی آزادی اور خود مختاری کا اظہار ہوتا ہے، جب کہ مَاشِئْتُمْ سے فکری، ذہنی اور قلبی آزادی کا ثبوت مہیا ہوتا ہے کہ انسان اپنی ذہنی پسند اور نیت کے انتخاب میں بھی جس قسم کی روش چاہے اختیار کر سکتا ہے۔ وہ نہ سوچ میں پابند اور مقید ہے اور نہ عمل و کردار میں۔

۳۔ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ: اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کے جملہ اعمال و افعال کو ذاتِ باری دیکھ رہی ہے تاکہ اسے جزا و سزا بھی دی جا سکے۔ اسے اگرچہ نظری، فکری اور عملی اعتبار سے آزادی اور خود مختاری دی گئی ہے، مگر اس آزادی کے عطا کیے جانے کا مقصد اسے شُتر بے مہار کر دینا نہیں، بلکہ اسے یہ احساس دلانا ہے کہ ہر عمل کو اپنے منطقی انجام تک پہنچایا جائے گا اور اُسے اپنی صوابدید کے مطابق کیے ہوئے اعمال پر بارگاہِ ایزدی میں جواب دِہ ہونا ہوگا۔ قرآنِ حکیم کے مطالعے کی روشنی میں انسان کو آزادی دیئے جانے کے مقاصد بیان کیے جا سکتے ہیں جن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

اللہ تعالیٰ کا تصوّرِ عدل

خداوند تعالیٰ کسی معاملے میں بھی اپنی کسی مخلوق پر ظلم نہیں کرتا۔ اس کا ہر فعل عدل و انصاف پر مبنی ہوتا ہے۔ اس نے اس کارخانۂ قدرت کو قانونِ عدل ہی پر قائم رکھا ہوا ہے۔ وہ نہ صرف خود عدل و انصاف کے تمام تقاضے پورے کرتا ہے بلکہ اپنے بندوں کو بھی یہ تعلیم دیتا ہے کہ وہ کسی پر ظلم اور زیادتی نہ کریں۔ چنانچہ سورۃ المائدہ میں ارشاد ہے:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ   اور بعض لوگوں کی دشمنی تم کو اس بات

Marfat.com

قَوْمٍ عَلٰٓى اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ[1]

پر آمادہ نہ کرے کہ انصاف چھوڑ دو۔ (ان سے بھی) انصاف کیا کرو کہ یہی پرہیزگاری کی بات ہے۔

دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۭ[2]

اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو۔

عدل کی تعریف علماءِ لغت نے ان الفاظ میں کی ہے:

وَضْعُ الشَّیْءِ عَلٰی مَحَلِّہٖ[3]

کسی چیز کو اس کے صحیح ٹھکانے پر رکھنا۔

دوسرے لفظوں میں حقدار کو حق دینا مستحق کو اس کا جائز مقام دینا۔ عدل ہے، جب کہ اس کے برعکس روش اختیار کرنا ظلم و جور ہے۔ قرآن کریم ہر حال اور ہر صورت میں عدل کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ خواہ معاملہ اپنے کسی قریب ترین عزیز حتّٰی کہ ماں باپ کا ہو۔ چنانچہ سورۃ النساء میں ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّھَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاۗءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓي اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۣ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ[4]

اے اہل ایمان! انصاف پر قائم رہو، اور خدا کے لیے سچی گواہی دو خواہ (اس میں) تمہارا یا تمہارے ماں باپ اور رشتہ داروں کا نقصان ہی ہو۔ کوئی امیر ہے یا فقیر، خدا ان کا خیر خواہ ہے۔ تو تم خواہش نفس کے پیچھے چل کے عدل کو نہ چھوڑو۔

---

[1] المائدہ (۵: ۸)

[2] النساء (۴: ۵۸)

[3] امام راغب الاصفہانی: مفردات القرآن۔ بذیل مادہ عدل۔

[4] النساء (۴: ۱۳۵)

Marfat.com

دوسرے مقام پر عدل و انصاف کی تلقین کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى[1] — خدا تم کو انصاف اور احسان کرنے اور رشتہ داروں کو (خرچ سے مدد) دینے کا حکم دیتا ہے۔

عدل کا مقام رفیع ــــ احسان

آیۂ کریمہ میں عدل کے ساتھ ساتھ احسان کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ عدل کا مفہوم تو سطور بالا میں بیان کیا جا چکا ہے جب کہ احسان کا مقام عدل کے مقام سے بھی بلند ہے۔ حق دار کو اس کا حق دینا عدل ہے۔ اپنا حق کم لینا اور دوسرے کا حق زیادہ دینا احسان ہے۔ گویا احسان جود فضل اور لطف و کرم کا متقاضی ہوتا ہے۔ اس طرح نیکی کی زندگی کے دو مدارج بیان کیے گئے ہیں:

پہلا درجہ یہ ہے کہ عدل و انصاف کی زندگی بسر کرو۔ نہ کسی کا حق کھاؤ، نہ کسی کو اپنا حق کھانے دو ــــ لیکن یہ درجہ بے حد احتیاط کا متقاضی ہے۔ اگر اس درجے سے ذرا بھی قدم لڑکھڑا جائے، یعنی معمولی سا بھی افراط و تفریط ہو جائے تو انسان درجۂ ظلم پر پہنچ جاتا ہے، اس لیے نیکی اور تقوٰی کے نقطۂ نظر سے ایک بلند تر درجہ بھی بیان کر دیا گیا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں انسان خدا تعالٰی کا محبوب بن جاتا ہے:

ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ[2] — بیشک خدا احسان کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔

"مقام احسان" ہے، اس لیے فرمایا: کہ اگر ہو سکے تو عدل کے اونچے درجے پر فائز رہو۔

---

[1] النحل (۱۶: ۹۰)

[2] البقرۃ (۲: ۱۹۵)

Marfat.com

حق دار کو اس کے حق سے بھی زیادہ دو۔ اور دوسروں کی خاطر اپنا حق لینا چھوڑ دو تاکہ اگر کبھی مقامِ احسان سے اُترنا بھی چاہو تو مقامِ عدل پر تو فائز رہ سکو۔

جو ذات اپنے بندوں کو ہر حال نظامِ عدل و احسان اپنانے کی تلقین کرے۔ جس کا اپنے بندوں سے مطالبہ یہ ہو کہ جب بھی اپنے یا کسی دوسرے کے متعلق فیصلے کا موقع آئے، تو عدل و انصاف کے اُصولوں کے مطابق فیصلہ کرو۔ وہ ذات جب خود مسند عدالت پر متمکن ہوگی تو کیا اپنے بندوں کے متعلق عدل و انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ نہیں رکھے گی؟ وہ ذات تو سراسر عدل و انصاف ہے۔ قرآن کریم میں بار بار اللہ رب العزت کے انصاف کا ذکر کیا گیا ہے۔ سورۃ الانبیاء میں ارشاد ہے:

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا ۖ وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ۗ[1]	اور ہم قیامت کے دن انصاف کا ترازو قائم کریں گے؛ تو کسی شخص کی ذرا بھی حق تلفی نہ کی جائے گی اور اگر رائی کے دانے کے برابر بھی کسی کا عمل ہوگا تو اس کو لا حاضر کریں گے۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ[2]	اور ہر نفس اپنے اعمال کا پورا پورا بدلہ پائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

ایک دوسرے مقام پر "روزِ محشر" کی منظر کشی کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے کہ اس دن ہر شخص کو اس کے اعمال کے مطابق فردِ عمل دی جائے گی۔ مجرمین کو بائیں ہاتھ میں اور نیکوکاروں کو سیدھے ہاتھ میں۔

اِس موقع پر ارشاد ہوگا:

---

[1] الانبیاء (۲۱ : ۴۷)

[2] آلِ عمران (۳ : ۲۵)

Marfat.com

ذٰلِکَ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْکُمْ وَاَنَّ اللّٰہَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ[1]

(اے سرکش) یہ اس (کفر) کی سزا ہے جو تیرے ہاتھوں نے آگے بھیجا تھا اور خدا اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔

خداوند تعالیٰ کی احسان پسندی

اور یہ امر بھی واضح کر دیا گیا کہ خداوند تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم کے بجائے جہاں تک ہو سکے گا، لطف و کرم اور فضل و احسان کا برتاؤ فرمائے گا۔ اس سلسلے میں ارشاد ہے:

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ۔[2]

جو کوئی (خدا کے حضور) نیکی لے کر آئے گا اس کو ویسی دس نیکیاں ملیں گی اور جو برائی لائے گا، اس کو ویسی سزا ملے گی اور اس پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

ایک دوسرے مقام پر اس احسان پسندی کا یوں ذکر کیا گیا:

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَى الَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔[3]

جو شخص نیکی لے کر آئے گا، اس کے لیے اُس جیسی دس نیکیاں ہیں، اور جو برائی لائے گا تو جن لوگوں نے بُرے کام کیے، ان کو بدلہ بھی اُسی طرح ملے گا جس طرح کے وہ کام کرتے تھے۔

جس خدا کا اپنے بندوں سے سلوک اور مہربانی کا یہ عالم ہو، اس کے متعلق بھلا یہ کیونکر

---

[1] الحج (۲۲ : ۱۰)

[2] الانعام (۶ : ۱۶۰)

[3] القصص (۲۸ : ۸۴)

Marfat.com

کہا جا سکتا ہے کہ اس نے انسان کی اچھی یا بُری تقدیر لکھ کر اُسے مجبور کر دیا ہے۔ نیز اگر اس کے حق میں کوئی بُرائی لکھی جا چکی ہے تو اس کی مخالفت کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

خدا تعالےٰ اگر بندے کو مجبور کرنا چاہے تو اُسے کوئی روک نہیں سکتا

قرآن کریم اس حقیقت کو خوب اچھی طرح واضح کرتا ہے کہ اگر خداوند تعالیٰ انسان کو مجبور کرنا چاہے تو کوئی اس کو روک نہیں سکتا۔ اور اگر ایسا کیا جاتا تو اس مجبور دُنیا کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا، چنانچہ فرمایا:

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَّاحِدَةً[1] — اور اگر خدا چاہتا تو تم سب کو ایک ہی جماعت بنا دیتا۔

نیز فرمایا:

لَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ أَجْمَعِيْنَ[2] — اگر وہ چاہتا تو سب کو ہدایت دے دیتا۔

مگر ایسی صورت میں جزا و سزا کا تصور بے معنی ہو کر رہ جاتا اور انسان کو کسی جگہ بھی اپنی مرضی چلانے کا اختیار باقی نہ رہتا۔ اس کے برعکس خداوند تعالیٰ نے انسان کو عملی آزادی مرحمت فرمائی اور فرمایا:

إِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ۔ — جو چاہو، عمل کرو۔

یہ خداوند تعالیٰ کی طرف سے انسان کے آزاد اور مختار ہونے کی عقلی دلیل ہے۔

جزا و سزا اور نظامِ عدل

یہ امر اچھی طرح واضح کر دیا گیا ہے کہ خداوند تعالےٰ اپنے کسی بندے پر ادنیٰ درجے کا ظلم بھی گوارا نہیں کرتا۔

---

[1] النحل (۱۶ : ۹۳)

[2] الانعام (۶ : ۱۵۰)

Marfat.com

اسی سے نظام عدل کے ساتھ جزا و سزا کا تعلق بھی واضح ہو جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد فرمایا گیا:

إِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ[1] — نہیں بدلہ دیا جائے گا جو تم کرتے تھے۔

دوسرے مقام پر مزید واضح کیا گیا:

وَأَنْ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ[2] — اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے، جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔

ایک اور مقام پر اعلان ہوا:

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ[3] — بندہ اچھے کام کرے گا، تو اُسے اس کا فائدہ ملے گا، بُرے کام کرے گا تو اُسی کو نقصان پہنچے گا۔

جزا و سزا اور اتمام حجت

جزا و سزا کے لیے اللہ رب العزت کا ایک اٹل اصول ہے کہ وہ اس وقت تک کسی قوم پر عذاب نازل نہیں کرتا جب تک اتمام حجت نہ کر لے۔ چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے:

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتَّىٰ نَبْعَثَ رَسُولًا[4] — اور جب تک ہم پیغمبر نہ بھیج لیں عذاب نہیں دیا کرتے۔

---

[1] التحریم (۶۶ : ۷)

[2] النجم (۵۳ : ۳۹)

[3] البقرہ (۲ : ۲۸۶)

[4] بنی اسرائیل (۱۷ : ۱۵)

Marfat.com

اِس سلسلے کا دوسرا اُصول یہ ہے کہ :

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى۔[1] — اور کوئی اُٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اُٹھائے گا۔

اسی بنا پر قیامت کے روز ہر شخص خود اپنی فکر میں مبتلا ہوگا۔ چنانچہ سورۂ عبس میں ارشاد فرمایا:

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ۙ
وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ۙ وَصَاحِبَتِهٖ
وَبَنِيْهِ ۭ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ
يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ[2]

اس دن بھائی اپنے بھائی سے دُور بھاگے گا اور اپنی ماں اور اپنے باپ سے اور اپنی بیوی اور بیٹوں سے نفور ہوگا۔ ہر شخص اس روز اپنی فکر میں ہوگا۔

صرف یہی نہیں بلکہ وہ اس بات پر آمادہ ہوگا کہ اس کی جگہ اس کے تمام متوسلین اور متعلقین کو پکڑ لیا جائے اور اس کی جان بخشی ہو جائے۔ چنانچہ سورۂ المعارج میں ارشاد فرمایا:

يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ
مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بِبَنِيْهِ ۙ
وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ ۙ وَفَصِيْلَتِهِ
الَّتِيْ تُـْٔوِيْهِ ۙ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ
جَمِيْعًا ۙ ثُمَّ يُنْجِيْهِ[3]

عذاب کے بدلے میں سب کچھ دے دے (یعنی) اپنے بیٹے اور اپنی بیوی اور اپنے بھائی اور اپنا خاندان جس میں وہ رہتا تھا اور زمین پر جتنے بھی آدمی ہیں سب کچھ دے دے، اور اپنے تئیں عذاب سے چھڑا لے۔

---

[1] فاطر (۳۵ : ۱۸)

[2] عبس (۸۰ : ۳۴-۳۷)

[3] المعارج (۷۰ : ۱۱ تا ۱۴)

Marfat.com

البتہ نیکوکار اور پرہیزگار لوگ اس کلیے سے مستثنیٰ ہوں گے۔ اسی لیے فرمایا:

اَلْاَخِلَّاءُ یَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ[1]

جو آپس میں دوست ہیں، اس روز ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے مگر پرہیزگار (کہ باہم دوست ہی رہیں گے)

بالفاظِ دیگر اس روز سبھی پریشان اور متفکر ہوں گے۔ مگر خدا تعالےٰ کے وہ بزرگ و برتر بندے جو دُنیا میں بھی دوسروں کی فکر میں غلطاں رہتے تھے۔ اس دن بھی اپنے بجائے دوسروں کی فکر میں مبتلا ہوں گے۔ اور اپنے اپنے درجے اور رُتبے کے مطابق خدا تعالےٰ کی بارگاہ سے منصبِ شفاعت پر سرفراز ہوں گے۔ مگر اُن کی شفاعت، شفاعتِ صغریٰ ہو گی۔ جب کہ سب سے بڑی شفاعت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ہو گی۔

بہر حال جب تک اتمامِ حجت نہ کر دیا جائے اقوام و ملل مبتلائے عذاب نہیں ہوتیں، چنانچہ ایک دوسرے مقام پر ارشادِ باری ہے:

وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا[2]

اور جب ہمارا ارادہ کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ہوا تو وہاں کے آسودہ لوگوں کو (خواہش پر) مامور کر دیا، وہ نافرمانیاں کرتے رہے، پھر اس پر عذاب کا حکم ثابت ہو گیا، اور ہم نے اُسے ہلاک کر ڈالا۔

دوسرے لفظوں میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا تعالےٰ کے ہاں کسی ضابطے اور کسی قانون

---

[1] الزخرف (۴۳ : ۶۷)

[2] بنی اسرائیل (۱۷ : ۱۶)

Marfat.com

کے بغیر کسی قوم کو ہلاک اور برباد کرنے کا اصول کارفرما نہیں، بلکہ جس بستی اور جس قوم کو ہلاک کرنا مقصود ہوتا ہے، خداوند تعالیٰ اس بستی اور اس قوم کی قیادت کی طرف (خواہ مذہبی قیادت ہو، یا سیاسی یا اقتصادی) حکم نازل کیا جاتا ہے، اُنھیں اطاعت اور فرمانبرداری کی ترغیب دی جاتی ہے لیکن جب یہ وڈیرے نما لوگ خدا تعالیٰ کے احکام کی پروا نہیں کرتے اور خدا تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ آخری حد کو بھی عبور کر جاتے ہیں۔ تو پھر اُن پر عذابِ خداوندی قہر بن کر ٹوٹ پڑتا ہے اور اُن کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جاتا ہے۔ کیونکہ جو قوم خود اپنی حالت بدلنا نہ چاہے، خدا تعالیٰ اس کی حالت کو نہیں بدلتا۔ اسی لیے سورۃ الرعد میں ارشاد فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ۔[1]	خدا اس (نعمت کو) جو کسی قوم کو (حاصل) ہے، نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت کو نہ بدلے۔

اتمامِ حجّت کا مفہوم

اتمامِ حجّت کا مفہوم یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ لوگوں کے سامنے اپنے احکام کی اطاعت یا خلاف ورزی کے انجام و عواقب کو واضح فرما دیتا ہے۔ اُنھیں بتا دیا جاتا ہے کہ اطاعت کی صورت میں کیا صلہ اور خلاف ورزی کی صورت میں کیا سزا دی جائے گی۔ یہ سب کچھ جاننے کے باوجود کوئی قوم راہِ راست پر نہیں آتی تو پھر اس پر خدا تعالیٰ کی طرف سے حجّت تمام ہو جاتی ہے اور خدا تعالیٰ اس پر اپنی گرفت مضبوط کر لیتا ہے۔ اسی لیے فرمایا:

لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰہِ حُجَّۃٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ۔[2]	تاکہ رسولوں کی بعثت کے بعد خدا تعالیٰ پر لوگوں کی کوئی حجّت نہ رہ جائے۔

---

[1] الرعد (۱۳: ۱۱)

[2] النسآء (۴: ۱۶۵)

Marfat.com

ذاتِ خداوندی انسان کی اس قدر سچی خیر خواہ ہے کہ اس پر عذاب نازل کرنے سے پہلے اس کو بار بار فہمائش کرتی ہے۔ محبت، پیار اور پھر ہلکی پھلکی ڈانٹ ڈپٹ سے اس کے گمراہی کی طرف بڑھنے والے قدموں کو روکنے کی سعی کرتی ہے۔ اُس ذات کا ارشادِ گرامی ہے کہ:

وَلَنُذِيقَنَّهُم مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ [1]

اور ہم ان کو (قیامت کے) بڑے عذاب کے سوا عذابِ دنیا کا بھی مزہ چکھائیں گے شاید (ہماری طرف) لوٹ آئیں۔

اُس ذات کے متعلق بھلا یہ کیسے باور کر لیا جائے کہ اس نے انسان کو پیدا ہوتے ہی اپنی ازلی تقدیر کے شکنجے میں جکڑ کر مجبور اور بے بس بنا دیا ہے۔

اخلاقی جدوجہد

اللہ ربُّ العزت کی طرف سے انسان کو تیسرا تصوّر اخلاقی جدوجہد کا دیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۂ ملک میں ہے:

الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا [2]

اسی نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون اچھے عمل کرتا ہے۔

یعنی اچھے اور بُرے عمل جانچنے کے لیے کائنات کا یہ سٹیج سجایا گیا، دوسری جگہ ارشاد فرمایا گیا:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ

ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا ہے۔ پھر (رفتہ رفتہ) اس کی

---

[1] السجدہ (۳۲ : ۲۱)

[2] الملک (۶۷ : ۲)

Marfat.com

اَسْفَلَ سَافِلِيْنَ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ؕ[۱]

حالت کو بدل کر پست کر دیا۔ مگر جو لوگ ایمان اور نیک عمل کرتے رہے، اُن کے لیے بے انتہا اجر ہے۔

ایک اور مقام پر ہے:

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۙ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۙ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۙ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ؕ[۲]

اور (قسم ہے) انسان کی اور اس کی جس نے اس کے (اعضاء) کو برابر کیا، پھر اس کو بدکاری (سے بچنے) اور پرہیزگاری (کرنے کی) سمجھ دی جس نے اپنے نفس (روح) کو پاک رکھا، وہ مراد کو پہنچا اور جس نے اُسے خاک میں ملایا، وہ خسارے میں رہا۔

ایک اور جگہ اس نکتے کی وضاحت یوں فرمائی:

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ؕ[۳]

جو لوگ بُرے کام کرتے ہیں، کیا وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم اُن کو اُن لوگوں جیسا کر دیں گے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے، اور ان کی زندگی اور موت یکساں ہو گی۔ جو یہ دعوے کرتے ہیں، بُرے ہیں۔

ان تمام آیات سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ خداوند تعالیٰ انسان کو

۱؎ التین (۹۵ : ۴ - ۶)

۲؎ الشمس (۹۱ : ۷ - ۱۰)

۳؎ الجاثیہ (۴۵ : ۲۱)

Marfat.com

اخلاقی جد وجہد اپنانے کی تلقین فرماتا ہے۔ یہ جبھی ممکن ہے کہ انسان کو آزاد اور خود مختار گمان کیا جائے اور اگر خداوند تعالیٰ انسان کو پیدائشی طور پر اپنی قدرت کی زنجیروں میں اس طرح جکڑ دے کہ وہ بیچارہ اپنی مرضی سے نہ نیکی کر سکے، نہ بدی۔ تو اس کے ہاتھ بندھے ہوئے ہونے کی صورت میں اس سے جو کوئی نیکی صادر ہوتی ہے یا برائی سرزد ہوتی ہے، تو ایسی نیکی کو نیکی اور ایسی بدی کو بدی ہرگز نہ کہا جا سکتا۔ اس لیے کہ مجبور آدمی کی نہ نیکی اپنی ہوتی ہے اور نہ بدی۔

اس کی مثال اس طرح سمجھی جا سکتی ہے کہ اگر آپ کسی شخص کے ہاتھ پاؤں مضبوطی سے باندھ دیں اور اس کو پوری طرح بے بس اور بے دست و پا کرنے کے بعد اُسے کہیں کہ وہ آپ کی کسی سابقہ غلطی کو معاف کر دے تو اس حالت میں کیا دنیا کی کوئی عدالت عفو و درگذر کو کوئی اہمیت دے سکتی ہے۔؟ عفو تو وہی معتبر ہے کہ متعلقہ شخص انتقام لینے یا معاف کرنے پر قادر ہو اور انتقام نہ لے، معاف کر دے۔

گویا مجبوری کی حالت کو "اضطرار" تو کہہ سکتے ہیں، نیکی و بدی نہیں قرار دے سکتے۔ چنانچہ جب ہمارے دنیوی قوانین میں مجبوری اور اختیار میں اتنا فرق کیا جاتا ہے، اور جبر و اکراہ کی حالت میں کیا ہوا کوئی قول اور ارتکاب کیا ہوا کوئی جرم معتبر نہیں سمجھا جاتا، تو اللہ تعالیٰ جس نے فرمانِ نبوی کے مطابق تخلیقِ کائنات کے وقت سے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ:

ان رحمتی سبقت غضبی [1] — میری رحمت میرے غضب پر غالب رہے گی۔

اس سے کیونکر یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ انسان کی اس بے بسی اور بے چارگی د

---

[1] مشکوٰۃ شریف (۱۹۹)

Marfat.com

مجبوری سے غلط فائدہ اُٹھائے گا۔ حاشا وکلا۔

حالتِ اضطرار اور قانونِ اسلامی

یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ حالتِ اضطرار میں شریعتِ اسلامیہ حلال اور حرام کی تفریق اُٹھا لیتی ہے اور جان بچانے کی غرض سے میتہ اور خنزیر تک کے گوشت کو کھانے کی اجازت دیتی ہے۔ چنانچہ سورۃ البقرہ میں ہے:

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيۡكُمُ الۡمَيۡتَةَ وَالدَّمَ وَلَحۡمَ الۡخِنۡزِيۡرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيۡرِ اللّٰهِ ‌ۚ فَمَنِ اضۡطُرَّ غَيۡرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَيۡهِ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ [1]

اس نے تم پر مرا ہوا جانور اور خون اور سؤر کا گوشت اور جس پر خدا کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے، حرام کر دیا ہے۔ ہاں جو ناچار ہو جائے (بشرطیکہ) خدا کی نافرمانی نہ کرے اور حد (ضرورت) سے آگے نہ بڑھے، اس پر کچھ گناہ نہیں۔ بے شک خدا بخشنے والا (اور) رحم کرنے والا ہے۔

خداتعالیٰ نے کتنا آفاقی، کائناتی اور عالمگیر تصور دیا ہے کہ حالتِ اضطرار میں حرام تک کو مباح قرار دے دیا، دوسرے مقام پر فرمایا:

وَقَدۡ فَصَّلَ لَكُمۡ مَّا حَرَّمَ عَلَيۡكُمۡ اِلَّا مَا اضۡطُرِرۡتُمۡ اِلَيۡهِ‌ؕ [2]

حالانکہ جو چیزیں اس نے تمہارے لیے حرام ٹھہرا دی ہیں، وہ ایک ایک کر کے بیان کر دی ہیں، مگر اس صورت میں کہ ان کے کھانے کے لیے ناچار ہو جاؤ۔

---

[1] البقرہ (۲ : ۱۷۳)

[2] الانعام (۶ : ۱۱۹)

Marfat.com

نیز فرمایا:

فَمَنِ اضْطُرَّ فِیْ مَخْمَصَةٍ غَیْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ، اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔[1]

ہاں جو شخص بھوک میں نا چار ہو جائے (بشرطیکہ) گناہ کی طرف، تو خدا بخشنے والا اور مہربان ہے۔

انہی وجوہ و اسباب کی طرف اشارہ کرتے ہوتے سورۃ الحج میں ارشاد فرمایا:

وَمَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ۔[2]

اور تم پر دین کی کسی بات میں تنگی نہیں کی۔

دوسرے مقام پر فرمایا:

لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا وُسْعَهَا۔[3]

خدا تعالیٰ کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔

اور حضور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

بعثت بالحنفیه السمحه[4]

مجھے آسان دین دے کر بھیجا گیا ہے۔

اور اسلام سے قبل کی حالت کی منظر کشی کرتے ہوئے قرآن کریم بیان کرتا ہے:

وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْهِمْ۔[5]

اور ان پر سے بوجھ اور طوق جو ان کے سر پر اور گلے میں تھے، اتارتے ہیں۔

---

[1] المائدہ (۵ : ۳)

[2] الحج (۲۲ : ۷۸)

[3] البقرۃ (۲ : ۲۸۶)

[4] مشکوٰۃ شریف، ۲۳۶

[5] الاعراف (۷ : ۱۵۷)

Marfat.com

یہ "اغلال" واصر کیا ہے؟ یہ غلط عقاید وتصورات کی زنجیریں اور توہمات کی بیڑیاں تھیں، جن میں انسانیت کا بند بند جکڑا ہوا تھا۔ حضورؐ کی بعثت کا ایک مقصد انسانیت کو ان زنجیروں اور بندھنوں سے نجات دلانا بھی تھا، اسی بنا پر ارشاد خداوندی ہے:

وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ ۙ — اور آپ کیا جانیں کہ گھاٹی کیا ہے،

فَكُّ رَقَبَةٍ [1] — وہ کسی کی گردن چھڑانا ہے۔

بہرحال قرآن نے انسان کو مجبوریوں سے نجات کی راہ دکھائی، اس کے لیے سہولتوں کا اعلان کیا جن میں سے ایک حالت اضطرار اور حالت اختیار کا نمایاں فرق بھی ہے۔

سیدنا فاروقِ اعظم کا ارشاد

خلافت فاروقی کے زمانے میں حجاز مقدس میں سخت قحط پڑا۔ اناج مفقود ہو گیا۔ اس حالت میں حضرت عمر فاروق نے چور کے ہاتھ کاٹنے کی سزا پر عمل درآمد روک دیا۔ اور فرمایا جب تک حکومت ہر شخص کو ضروریاتِ زندگی مہیا نہیں کر سکتی۔ وہ قطع ید کی حد نافذ کرنے کا اختیار نہیں رکھتی۔ [2]

سلطنتِ اسلامیہ کا فرض

سیدنا فاروق اعظم کے اس فرمان اور عمل سے قرآن و حدیث کے بیان کردہ اصول کی پوری طرح وضاحت ہو جاتی ہے۔ اور یہ قرار پاتا ہے کہ سلطنتِ اسلامیہ کا فرض صرف حدود و تعزیرات کا نفاذ ہی نہیں بلکہ اس کا اصل فرض برائی اور جرم کے مبادیات اور اسباب کا قلع قمع کرنا بھی ہے یعنی چوری ڈکیتی اور دیگر بیماریوں کے اصلی محرکات کا کھوج لگانا اور پھر اس کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنا اسلامی حکومت کا اولین فرض ہے۔

---

[1] البلد (۹۰: ۱۲-۱۳)

[2] کتاب الخراج، امام ابو یوسف، ص ۱۴۷ مطبوعہ قاہرہ ۱۳۰۲ھ۔

Marfat.com

آج کے دور میں اسلامی حدود کو سخت بتایا جاتا ہے، مگر یہ نہیں دیکھا جاتا کہ ان حدود کے عملی نفاذ سے پہلے مملکتِ اسلامیہ میں زندگی گذارنے کے بہتر حالات پیدا کرنے کی ضمانت ملتی ہے۔ اگر تمام ممکنہ سہولتوں کے باوجود کوئی شخص بدی کی طرف جھکتا ہے، تو وہ واقعی اس قابل ہے کہ اسے سخت سے سخت سزا دی جائے۔

سیدنا فاروق اعظمؓ کے زمانے میں ایک مقدمہ

سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانے میں چوری کا ایک مقدمہ سماعت کے لیے پیش ہوا۔ صورتِ حال یہ تھی کہ کچھ ملازموں کو اپنے سرداروں کے اونٹ چرانے کے جرم میں ماخوذ کیا گیا تھا۔ جب مقدمہ چلا تو ان پر چوری پوری طرح ثابت ہو گئی۔ ابھی چوری کی سزا پر عمل درآمد نہ ہوا تھا کہ حضرت عمر فاروق کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ انھوں نے ان سرداروں کو بلا بھیجا جن کے پاس وہ لوگ ملازم تھے۔ وہ حاضر ہوئے تو فاروق اعظمؓ نے ان سے پوچھا کہ تم نے کتنی مدت سے اپنے ان ملازمین کو تنخواہیں نہیں دیں۔ پتا چلا کہ کافی عرصہ سے ان ملازمین کو تنخواہ نہیں مل رہی ہے۔ اس پر حضرت عمر فاروقؓ نے فیصلہ دیا کہ ان سرداروں سے اونٹوں کی دوگنا قیمت بطور تاوان وصول کی جائے۔[1]

ان واقعات سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ اسلام میں مجبوری اور حالت اختیار میں نمایاں طور پر فرق کیا گیا ہے۔

خداوند تعالیٰ نے لوگوں کو یہ تعلیم دی ہے کہ حرام بھی حالتِ اضطرار میں حلال ہو جاتا ہے اور اسے اپنے محبوب کے دین کے لیے بھی اکراہ و جبر گوارا نہیں:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ[2] — دین اسلام میں زبردستی نہیں (اور) ہدایت صاف طور پر ظاہر اور (ر) گمراہی سے الگ ہو چکی ہے۔

---

[1] الموطا، امام مالک، جلد ۲، صفحہ ۷۴۸، مطبوعہ قاہرہ ۱۹۵۱ء)

[2] البقرہ (۲: ۲۵۶)

Marfat.com

خداوند تعالیٰ نے ہمیں ایسا دین دیا ہے جس میں کوئی چیز دوسری چیز سے التباس نہیں رکھتی۔ خیر کو شر سے اور شر کو خیر سے، نیکی کو بدی سے اور بدی کو نیکی سے نیز حالتِ اختیاری کو حالتِ اضطراری سے ممیز کر دیا گیا ہے۔ اسی بنا پر جب حج جیسے مقدس فریضے کا حکم نازل ہوا تو اس کے ساتھ بھی حالتِ مجبوری کا لحاظ رکھا گیا، ارشاد ہے:

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا[1]	اور لوگوں پر خدا کا حق (یعنی فرض ہے) کہ جو اس گھر میں جانے کا مقدور رکھے، وہ اس کا حج کرے۔

ایک صحابی کا سوال اور حضورؐ کا جواب

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب حج کا حکم نازل ہوا تو ایک صحابی نے سوال کیا:

أَفِي كُلِّ عَامٍ يَا رَسُولَ اللهِ.	یا رسول اللہ! کیا یہ حج ہر سال فرض ہے۔

آپ خاموش رہے، اس نے سوال دہرایا مگر آپ ساکت رہے، اس نے تیسری مرتبہ اپنے سوال کا اعادہ کیا پھر بھی آپ خاموش رہے۔ مگر جب سائل کا شوق سوال دیکھا تو فرمایا:

لَوْ قُلْتُ نَعَمْ لَوَجَبَتْ وَلَمَا اسْتَطَعْتُمْ ثُمَّ قَالَ ذَرُونِي مَا تَرَكْتُكُمْ فَإِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِكَثْرَةِ سُؤَالِهِمْ[2]	اگر میں ہاں کر دوں تو تم پر ہر سال حج فرض ہو جائے، جو ظاہر ہے تمہاری استطاعت سے باہر ہے۔ پھر فرمایا جہاں میں خاموش رہوں وہاں تم بھی خاموش رہو۔ کیونکہ تم میں سے پہلی اُمتیں کثرتِ سوال سے ہلاک ہوئی ہیں۔

---

[1] آلِ عمران (۳: ۹۷)

[2] بخاری و مسلم، کتاب الحج، مشکوٰۃ شریف، کتاب الحج، ۱: ۵۵۴، حدیث ۲۳۹۱۔

Marfat.com

خلاصہ کلام یہ کہ اسلام دینِ فطرت ہے۔ یہ انسانوں کو آسانیاں اور سہولتیں دینے کے لیے ہے، یہ انسانیت کو تمام بندھنوں اور زنجیروں سے نجات دلانے آیا ہے۔ یہ دین انسان کے جسم سے جبر و اکراہ کا بوجھ اُتارتا ہے، اختیار اور اضطرار میں فرق کرتا ہے۔ اپنے مزاج کے اعتبار سے سراسر رحمت و رأفت اور شفقت و احسان ہے۔ اس سے یہ توقع بھلا کیسے ہو سکتی ہے کہ وہ انسان کو اس کے عمل اور اس کے ہر فعل میں مقید قرار دے گا۔

"اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے اختیارات اُمورِ خیر میں صرف کرنے کی توفیق بخشے۔"

(آمین)

Marfat.com

قضا و قدر

کا

انسانی زندگی میں کردار

Marfat.com

Marfat.com

○

انسان کے مجبور یا مختار ہونے اور اپنے اعمال کے کاسب ہونے کے مسائل پر بحث مکمل کر لینے کے بعد یہ دیکھنا چاہیے کہ اصل میں مسئلہ تقدیر کیا ہے، اور قضا و قدر میں باہمی فرق کیا ہے؟

(الف) قدر کا مفہوم

"قدر" کا لغوی مفہوم اندازہ کرنا، وزن کرنا، طے کرنا اور مقرر کرنا ہے، چنانچہ اس سلسلے میں ارشادِ باری ہے:

وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ مُبِينٍ [1] — اور ہر چیز کو ہم نے کتاب روشن یعنی لوحِ محفوظ میں لکھ رکھا ہے۔

دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:

بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَجِيدٌ ۝ فِي لَوْحٍ مَحْفُوظٍ [2] — (یہ کتاب ہزل و بطلان نہیں) بلکہ یہ قرآن عظیم الشان ہے، لوح محفوظ میں لکھا ہوا۔

---

[1] یٰسین (۳۶ : ۱۲)
[2] البروج (۸۵ : ۲۲)

Marfat.com

نیز فرمایا:

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ [۱]

خدا جس کو چاہتا ہے، مٹا دیتا ہے (اور جس کو چاہتا ہے) قائم رکھتا ہے اور اسی کے پاس اصل کتاب ہے۔

ان تمام آیات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کائنات بشمول بنی نوع انسان کے احوال و کوائف کا علم خدا تعالیٰ کے پاس ازل سے موجود ہے، جسے اس نے "اُم الکتاب" یا "لوحِ محفوظ" میں حفاظت سے لکھا ہوا ہے۔ اور "کل شی" کا مفہوم یہ ہے کہ کائنات کا کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ ذرہ بھی اس کلیے سے ماورا نہیں۔

بہت سی احادیث میں بھی اس مسئلے پر روشنی ڈالی گئی ہے مسلم شریف میں حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

كتب الله المقادير الخلائق قبل ان يخلق السموات والارض بخمسين الف سنة قال وكان عرشه على الماء [۲]

اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان پیدا کرنے سے پچاس ہزار سال قبل مخلوقات کی تقدیریں لکھ دی تھیں، جبکہ اس کا عرش پانی پر تھا۔

---

[۱] الرعد (۱۳:۳۹)

لوحِ محفوظ یا اُم الکتاب سے مراد خداوند تعالیٰ کا وہ علم ہے جس میں سب چیزوں کے احوال موجود ہیں۔

[۲] مسلم شریف، کتاب الایمان، مشکوٰۃ، کتاب الایمان، ۱:۳۳، حدیث ۷۔

Marfat.com

ایک دوسری روایت میں ہے:

ان اول ما خلق اللہ القلم فقال لہ اکتب فقال ما اکتب؟ قال اکتب القدر فکتب ما کان وما ھو کائن الی الابد[1]	سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قلم کو تخلیق فرمایا اور اسے حکم دیا کہ لکھ۔ اس نے عرض کیا کہ کیا لکھوں؟ فرمایا: مخلوقات کی تقدیریں لکھو۔ چنانچہ اس نے جو چیز ہو چکی تھی اور جو چیز ہونے والی تھی، سب لکھ دیں۔

اسی طرح ایک موقع پر بعض صحابہؓ نے آپؐ سے بوجوہ ترکِ لذات کی اجازت مانگی تو آپ نے فرمایا:

جَفَّ الْقَلَمُ بِمَا اَنْتَ لَاقٍ[2]	تجھے جو کچھ ملنا ہے، اسے قلم لکھ کر خشک ہو چکا ہے۔

اس موضوع پر بے شمار احادیث اور روایات مروی ہیں، جن سے مسئلہ تقدیر کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ روایات مختلف محدثین نے ثقہ راویوں سے نقل کی ہیں۔ لہٰذا ان روایات کے مستند ہونے میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

عوامی غلط فہمی اور اس کا ازالہ

ستم ظریفی یہ ہے کہ اس قسم کی آیات اور احادیث کا جو مفہوم عوام میں

---

[1] الترمذی، مشکوٰۃ شریف ۱: ۳۷، حدیث ۸۷۔

[2] البخاری، کتاب النکاح، مشکوٰۃ ۱: ۳۵، حدیث ۸۱۔

Marfat.com

لیا جاتا ہے، وہ قرآن وحدیث کی مراد کے قطعاً منافی بلکہ متضاد ہوتا ہے۔ عوام کے بعض حلقوں نے ان آثار وروایات سے یہ تاثر لیا ہے کہ مسئلہ تقدیر کا مفہوم نوشتۂ تقدیر کے سامنے تمام مخلوق بالخصوص انسانوں کی بے بسی اور مکمل مجبوری ہے۔ عوام کے خیال میں مسئلہ تقدیر کے ذریعے خدا تعالیٰ نے اپنے بندوں کو مجبور اور مقید کر دیا ہے، وہ اس سے سرِمو بھی انحراف نہیں کر سکتے۔

(ب) قضا اور قدر کی دو اصطلاحیں اور ان کا مفہوم

ان دو مختلف اسلامی اصطلاحات میں خلطِ مبحث کے نتیجے کے طور پر عوام الناس اس مسئلے میں غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اگر ان دونوں اصطلاحوں کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو بڑی حد تک اس غلط فہمی کا ازالہ ہو سکتا ہے۔

قضا و قدر کے دو مفہوم ہیں، ان میں سے ایک آفاقی اور کائناتی سطح کے اعتبار سے اور دوسرا انسان کے شخصی وانفرادی احوال کے لحاظ سے ہے۔

قضا و قدر آفاقی و کائناتی اعتبار سے

آفاقی اور کائناتی اعتبار سے قضا و قدر کا مفہوم یہ ہے کہ قضا کا مفہوم تخلیق اور قدر کا مفہوم اختیار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ساتوں آسمانوں، زمین اور کائنات کے ساتوں طبقات پیدا کیے اور ان میں موجود لطیف وکثیف مخلوق کی تخلیق فرمائی، یہ خداوند تعالیٰ کی قضا ہے۔ اسی بنا پر سورۂ حٰمٓ السجدہ میں ارشاد فرمایا گیا،

فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ	پھر دو دن میں سات آسمان بنائے
سَمٰوٰتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ	اور ہر آسمان میں اس (کے کام)
وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ	کا حکم بھیجا۔

Marfat.com

آمـرَهـا لـه

یہاں قضا کا لفظ خلق یعنی پیدائش کے معنوں میں مستعمل ہوا ہے جبکہ قدر، قدرت اور تقدیر و قدیر کے الفاظ جو قرآنِ حکیم میں کثرت سے استعمال کیے گئے ہیں، ان کا مفہوم "اختیار" و اختبار (چننا) ہے۔ اس طرح "قضا و قدر" کے دو لفظوں میں تخلیقِ کائنات اور اس کی بقا و سالمیت کا راز پنہاں ہے۔ ان دو الفاظ میں قانون تخلیق کی وہ بنیادی شق بیان کی گئی ہے جس کی بنیاد پر قدرت کا یہ عظیم اور پُرہیبت کارخانہ تخلیق کیا گیا اور اس کے ایک ایک ذرے کو ادراک و شعور بخشا گیا ہے

انسانی زندگی میں قدر کا مفہوم

انسان کی انفرادی اور شخصی سطح پر قدر کے معنی اندازہ اور قضا کے معنی اجراء کے ہیں (مفردات راغب الاصفہانی)

خداوند تعالیٰ نے اس دنیا میں انسان کے لیے اچھائی اور برائی تخلیق کر کے اسے اس میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے اور اپنے عمل کے لیے مخصوص کر لینے کا اختیار یعنی قدرت عطا فرمائی ہے۔ وہ چاہے تو نیکی کو اختیار کرے اور چاہے تو بدی کو اپنا وطیرہ بنا لے۔ چنانچہ سورۃ البلد میں ہے:

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِۙ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِۙ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِۚ [2]

بھلا ہم نے اس کو دو آنکھیں نہیں دیں، اور زبان اور دو ہونٹ (نہیں دیے) (یہ چیزیں بھی دیں)، اور اس کو (خیر و شر) کے دونوں راستے بھی دکھا دیے۔

---

[1] حٰم السجدہ (۴۱: ۱۲)

[2] البلد (۹۰: ۸ تا ۱۰)

Marfat.com

بالفاظِ دیگر خداوند تعالیٰ نے انسان کو جس قدر ظاہری اور باطنی صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں، ان سب کا ایک واضح مقصد یہ ہے کہ اگر وہ چاہے تو اپنی صلاحیتوں کو راہِ خیر میں صرف کر کے مراتب کمال سے ہمکنار ہو جائے اور چاہے تو اپنی ان قوتوں کو بدی کے بیج بونے اور کاٹنے کے لیے وقف کر دے۔ خدا تعالیٰ نے ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

لَآ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ [1]

دینِ اسلام میں زبردستی نہیں ہے، ہدایت صاف طور پر ظاہر ہو کر گمراہی سے الگ ہو چکی ہے۔

نیز فرمایا:

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ [2]

اور کہہ دو، یہ قرآن تمہارے پروردگار کی طرف سے برحق ہے۔ جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کافر رہے۔

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے اصول کی تبلیغ کی وضاحت کرنے کی تلقین کرتے ہوئے ارشاد ہوا:

مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ [3]

پیغمبر کے ذمے تو خدا کا پیغام پہنچا دینا ہے۔

انبیاءِ کرام علیہ السلام بھی اپنی قوموں کو تذکیر و موعظت کے بعد فرماتے تھے:

---

[1] البقرہ (۲ : ۲۵۶)

[2] الکہف (۱۸ : ۲۹)

[3] المائدہ (۵ : ۹۹)

Marfat.com

وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ؂ — اور ہمارے ذمے تو صاف صاف پہنچا دینا ہے اور بس۔

مقصد یہ تھا کہ پیغمبروں کا کام ایصال الی المطلوب نہیں، بلکہ محض خدا کے پیغام کا پہنچانا تھا۔ خدائی حکم کے پہنچ جانے کے بعد اب یہ کام متعلقہ فرد کا ہے کہ وہ چاہے تو انبیا کی باتوں پر کان دھرے اور چاہے تو اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لے۔ اسی بنا پر سورۂ کافرون میں اتمام حجت کرتے ہوئے فرمایا:

لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ؂ — تم اپنے دین پر، میں اپنے دین پر۔

قضا کا مفہوم

"قدر" کے مفہوم کی وضاحت ہو چکی۔ قضا سے مراد وہ اصول اور وہ قوانین فطرت ہیں جن کے تحت یہ کارخانۂ قدرت اپنے اپنے وقت پر، اپنے مخصوص خصائص و مصالح کے ساتھ معرض تخلیق میں لایا گیا ہے اور جن کے تحت اس کائنات کے نظام کی بقا کو علت و معلول، سبب و مسبب نیز عمل اور ردِ عمل کے نظام کے تحت منضبط کر دیا گیا ہے۔ اگر کوئی شخص نیکی کرے گا تو اس کے نتائج بھی نیک نکلیں گے اور برائی کے ثمرات بھی ویسے ہی برے ہوں گے۔ انسان جو کچھ کرے گا، اس کا بدلہ پائے گا۔ جس مقصد کے لیے تگ و دو اور جد و جہد کرے گا اس کے حصول میں کامیاب و کامران ہوگا۔ اس تمام نظام قدرت کا نام قضائے الٰہی ہے۔ اس کا ذکر سورۃ البقرہ میں یوں کیا گیا ہے:

؂ یٰسین (۳۶: ۱۷)

؂ الکافرون (۱۰۹: ۶)

Marfat.com

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا	جو لوگ کافر ہیں، انہیں تم نصیحت
سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ	کرو یا نہ کرو، ان کے لیے برابر ہے، وہ
اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ[1]	ایمان نہیں لائیں گے۔

بالفاظ دیگر جس شخص نے ہدایت کے آفتاب عالمتاب کی تمام ترجگمگا ہٹوں کے باوجود کفر کے اندھیرے اور پُر خطر راستے ہی کو اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا، اس کے ہدایت سے محروم رہنے کا فیصلہ قدرت کی طرف سے صادر کر دیا جاتا ہے۔ یعنی ہدائیت سے محروم رہنا خود اس کے اپنے فعل کا نتیجہ ہے۔

ایک دوسرے مقام پر ایسے لوگوں کی قلبی حالت کی ترجمانی کرتے ہوئے ارشاد ہوا،

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى	دیکھو یہ جو (اعمال بد کرتے ہیں)
قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا	ان کے دلوں پر زنگ بیٹھ گیا ہے۔
يَكْسِبُوْنَ[2]	

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد

اس مقام ضلالت کی حقیقت بیان کرتے ہوئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ،

"جب کوئی شخص نیک کام کرتا ہے تو اس کے دل پر نور کا ایک نکتہ ثبت ہو جاتا ہے اور اگر وہ نیکیاں کرتا چلا جائے تو اس کا دل بقعۂ نور بن جاتا ہے۔ پھر

---

[1] البقرہ (۲ : ۶)

[2] المطففین (۸۳ : ۱۴)

Marfat.com

اس کی نیکی کا اثر اس کے چہرے پر بھی ظاہر ہونے لگتا ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص برائی کرتا ہے اور اس پر خدا کے سامنے توبہ نہیں کرتا تو اس کے دل پر ایک سیاہ نکتہ لگا دیا جاتا ہے۔ اب اگر وہ شخص توبہ کرے تو وہ نکتہ محو ہو جاتا ہے۔ توبہ نہ کرے بلکہ دوسرا گناہ کرلے۔ پھر تیسرا اور اسی طرح گناہ پر گناہ کرتا چلا جائے تو ہر گناہ کے بدلے اس کے دل پر ایک ایک نکتہ بڑھا دیا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ جاری رہتا ہے تاوقتیکہ اس کے دل کی دنیا سیاہ بادلوں کی طرح ظلمت کدہ بن کر رہ جاتی ہے اور اس میں قبولِ حق کی کوئی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ یہی وہ ران (زنگ) ہے جس کا سورۃ المطففین میں یوں ذکر کیا گیا ہے: كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ [۱]

یہاں پہنچ کر بندے میں قبولِ حق کا جذبہ مکمل طور پر مر جاتا ہے اور وہ مجسمۂ شیطنت اور سرچشمۂ شر بن جاتا ہے۔

یہاں یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ ان کے دل کا تاریک کر دیا جانا نیز ان کے قلوب و اذہان پر مہرِ خداوندی کا ثبت ہو جانا ان پر کوئی ظلم ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ خود ان کے اعمال و کسب کا نتیجہ اور ثمرہ ہے نیز اُن کے اپنے افعالِ شنیعہ کا ردِّ عمل ہے۔ اُنہوں نے جو کچھ چاہا تھا، اُس کا انجام انہیں دکھا دیا گیا۔

حق کی پکار جاری رہتی ہے

(اُصولِ قضا کے تحت) یہ سب کچھ ہوتا اور بار بار دہرایا جاتا ہے، مگر قانونِ قدر کے تحت نافرمان بندوں کو قبولِ حق کے اختیار کے ساتھ ساتھ خدا تعالیٰ کی طرف

---

[۱] ابنِ جریر الطبری۔ جامع القرآن فی تفسیر القرآن مطبوعہ قاہرہ ۱: ۸۶، تفسیر سورۃ البقرہ آیت ۶-۷۔

Marfat.com

سے حق کی دعوت کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ان کے کانوں اور آنکھوں کے بند دریچوں کو کھولنے اور ان کے مسخ شدہ قلوب و اذہان کو مائل بہ حق کرنے کی کوشش جاری رکھی جاتی ہے۔ مزید برآں ان پر توبہ و استغفار کے دروازے بھی کھلے رکھے جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ حکمِ قدر کے تحت ہمیشہ سے جاری رہا ہے اور جاری رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر "ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ" کا حکم نازل ہونے اور کفار و معاندین کے قلوب کے مسخ شدہ ہونے کی خبر زبانِ رسالت سے نشر کیے جانے کے باوجود بھی پیغمبرِ اسلام کی طرف سے ان کو ہدایت و تبلیغ جاری رہی اور ان کی ہلاکت سے پہلے کسی موقع پر بھی یہ فیصلہ نہیں کر لیا گیا کہ اب پیغامِ ہدایت کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

بیمار شخص کے لیے مرغن خوراک

عملی زندگی میں اس کی مثال اس طرح سمجھی جا سکتی ہے کہ کوئی شخص بے احتیاطی کر کے اور خراب اور ناقص غذائیں کھا کر اپنا معدہ مکمل طور پر خراب کر لے۔ جب جسمانی کمزوری اور ضعف حد سے بڑھنے لگے تو اپنی بیماری کا صحیح طریقے سے علاج کرانے کے بجائے از خود مرغن اور قوت بخش غذاؤں کا استعمال شروع کر دے تو نتیجہ کیا ہو گا؟ ظاہر ہے کہ ایسی طاقت ور غذائیں اس شخص کو مزید بیمار اور مضمحل کر دیں گی۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ خوراک میں کچھ کمی ہے، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ اس کے معدے میں اسے قبول کرنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہی۔ اب اگر مذکورہ شخص یہ شکایت کرنے بیٹھ جائے کہ لوگ یہی غذائیں کھاتے ہیں اور طاقت ور ہو جاتے ہیں اور میں روز بروز مزید کمزور ہوتا جا رہا ہوں تو ایسے شخص کو ہمیشہ ایک ہی جواب ملے گا کہ اس میں کسی دوسرے کا قصور ہے، نہ غذا کا۔ یہ تو صرف اور صرف اسکا

Marfat.com

اپنا قصور ہے کہ اس نے پہلے اپنا معدہ خراب کیا، پھر اسی کیفیت میں مرغن غذائیں کھانی شروع کر دیں۔

اسی طرح ایک شخص بُرائی کی زندگی اختیار کرتا ہے۔ پھر اسی راستے پر بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ اب اگر قلب کے متعفن اور مردہ ہو جانے کی وجہ سے اس میں قبولِ حق کی صلاحیت نہیں رہی اور اس پر کوئی اعلیٰ سے اعلیٰ نصیحت بھی کارگر نہیں ہوتی تو اس میں کسی دوسرے کا کوئی قصور نہیں اور نہ ہی اس سوچ کا کوئی جواز ہے کہ "میرا مقدر ہی خراب تھا" اسے چاہیئے کہ وہ پہلے اپنے باطن کی اصلاح کرے۔ جہاں سے اصل بگاڑ اور فساد شروع ہوا ہے۔ جس بگاڑ کے ہوتے ہوئے اس پر تمام وعظ و نصیحت بے اثر ہو جاتی ہے اور پھر وعظ و نصیحت کی طرف دھیان دے۔

قدر مقدم — قضا مؤخر

بہرحال انفرادی اور شخصی سطح پر قضا و قدر کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ یہ دونوں باہم لازم و ملزوم ہیں۔ ان میں سے اول الذکر یعنی قدر کا تعلق بندے کے اختیار اور فعل سے ہے جبکہ مؤخر الذکر یعنی قضا کا تعلق خداوند تعالیٰ کے حکم کے نفاذ سے ہے۔ ان میں ترتیب یہ ہے کہ قدر ہمیشہ مقدم اور قضا ہمیشہ مؤخر ہوتی ہے۔
لفظی اعتبار سے قدر کا مفہوم اندازہ کرنا، کسی چیز کو ماپنا، تولنا ہے۔ انگریزی میں اس کا مفہوم (ASSESSMENT) (EVALUATION) وغیرہ ہے۔ جو عمل اس انداز کی بناپر واقع ہو اسے بھی قدر کہتے ہیں۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّا کُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ　　ہم نے ہر چیز اندازہ مقررہ کے ساتھ

Marfat.com

بِقَدَرٍ [1] پیدا کی ہے۔

اُردو میں "قدر" کا لفظ اندازے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً ہم یہ کہتے ہیں کہ "یہ چیز اس قدر کافی ہے" یا ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ بات "اس قدر درست ہے اور اس قدر غلط" پس قدر سے مراد اُردو میں ایک خاص اندازہ اور مقدار ہوتی ہے جبکہ قضا کا مفہوم اظہار اور بیان ہے۔

قدرت نے اپنے عالم الغیب والشہادہ ہونے کی بنا پر تخلیقِ کائنات سے پہلے اپنے بندوں کو اختیارات اور آزادی دینے کا جو فیصلہ کیا تھا، اس کا نام قدر ہے اور اس اندازے پر مبنی علم کے اظہار کا نام قضا ہے جیسے کوئی انتہائی قابل اور تجربہ کار اُستاد اپنے شاگردوں میں سے کسی ایک کے متعلق کہہ دے کہ فلاں طالب علم ضرور فیل ہوگا۔ اور ایک سال کے بعد وہ طالب علم فیل ہو جائے۔ تو کیا اُستاد کا ایک سال پہلے اس کے فیل ہونے کی پیشینگوئی کرنا اس کے فیل ہونے کا باعث ہوا یا اس کا اپنا عمل۔ ظاہر ہے کہ اُستاد کا اعلان بچے کے مستقبل (FUTURE) کو متاثر نہیں کر سکتا۔ اُستاد کے اس قول نے مذکورہ طالب علم کے فیل ہونے میں کوئی کردار ادا نہیں کیا۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ وہ محض اور محض اپنی نالائقی اور بے توجہی کی وجہ سے فیل ہوا ہے۔ اگر وہ محنت کرتا تو اسے یہ روزِ بد دیکھنا کبھی نصیب نہ ہوتا۔ البتہ اُستاد کا ایک سال قبل بتا دینا اُس کے کمالِ علمی اور مہارتِ تامہ کی دلیل ہے۔

موسمی حالات کی پیشین گوئی

اسی طرح محکمہ موسمیات کی طرف سے روزانہ موسمی حالات کی پیشینگوئی کی جاتی

---

[1] القدر (۵۴:۴۹)

Marfat.com

ہے جس میں کسی علاقے میں بارش کا ہونا اور کسی علاقے میں بارش کا نہ ہونا بھی شامل ہوتا ہے۔ اب اگر پیشینگوئی کے بعد اگلے روز بارش ہو جاتی ہے یا موسم خشک رہتا ہے تو ساری دنیا جانتی ہے کہ نہ بارش برسانے میں محکمہ موسمیات کو دخل ہے، نہ موسم کی خشکی میں۔ یہ تو محض حالاتِ سابقہ کے مختلف مخصوص نشانات اور علامات کی بنیاد پر مفروضہ معلومات کا اظہار تھا۔ بارش کا ہونا یا نہ ہونا تو نظامِ قدرت کا ایک حصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر یہ پیشینگوئیاں غلط بھی ثابت ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح ماہرینِ فلکیات چاند یا سورج کے گرہن کی پیشینگوئی کرتے ہیں اور اس کے مطابق چاند اور سورج کو گرہن لگ بھی جاتا ہے۔ لیکن یہ گرہن اس پیشینگوئی کی وجہ سے تو نہیں لگتا۔

پیشینگوئیوں کا پس منظر

یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ آخر لوگوں کو وقت سے پہلے آنے والے حوادث و واقعات کا پتا کیونکر چل جاتا ہے؟ وہ کیسے یہ معلوم کر لیتے ہیں کہ یہ واقعات رونما ہونے والے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اس کائنات کا ہر وجود ایک معین و مقرر سمت کی جانب محوِ سفر ہے۔ اس کے سفر کے دوران میں پیش آنے والے ہر واقعے کی کوئی نہ کوئی علت اور غایت ضرور ہوتی ہے۔ خالقِ کائنات نے ہر علت کے ساتھ معلول اور ہر سبب کے ساتھ مسبّب کو مشروط و ملزوم کر دیا ہے۔ تو جو لوگ اس کائنات کے کسی حصے یا کسی نظام کے علت و معلول یا سبب اور مسبّب کو جان جاتے ہیں، ان کے لیے واقعات کی رفتار کا رخ متعین کرنا اور ان کے وقوع کی ٹھیک ٹھیک گھڑیوں کا جان لینا دشوار نہیں رہتا۔ اس نوع کی تمام پیشینگوئیاں اسی زمرے میں آتی ہیں۔ یہ لوگ واقعات

Marfat.com

کے خارجی وقوع سے پہلے محض علت یا سبب کو جان کر اس کے معلول یا مسبب کا کھوج لگا لیتے ہیں۔

اس تفصیل سے یہ بات بخوبی ظاہر ہو جاتی ہے کہ ماہرینِ فلکیات ہوں یا ماہرینِ موسمیات، وہ اپنی پیشینگوئی کے ذریعے نظامِ کائنات کی سمت اور جہت تبدیل نہیں کرتے اور ایسا کر بھی نہیں سکتے۔ یہ جہت اور سمت تو خلاقِ عالم نے ان کو ابتداءِ آفرینش سے عطا کر رکھی ہے۔ یہ لوگ تو فقط علامات کو جان کر آنے والی ایک طے شدہ حقیقت کا اظہار کرتے ہیں۔ اور بس۔

زمانہ کے تین روپ ہیں: ماضی، حال، مستقبل۔ ماضی تو ہم پر عیاں ہے کہ اس کے تمام واقعات لوحِ دہر پر مرقوم ہو کر سب کی نگاہوں میں آچکے۔ ایک طرح سے حال بھی ہمارے علم اور ادراک کے دائرے میں ہے۔ البتہ مستقبل (FUTURE) زمانے کا وہ حصّہ ہے جو مکمل طور پر ہماری نگاہوں سے اوجھل اور مخفی ہے۔ اس کی ایک ایک کڑی پردۂ غیب میں مستور ہے۔ اسی بنا پر سورۂ لقمان میں خمس مغیبات (پانچ خفیہ اُمور) میں سے ایک امر یہ بھی ہے:

وَمَا تَدْرِيْ مَا ذَا تَكْسِبُ غَدًا[1] — اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کام کرے گا۔

لیکن مستقبل ہر ایک کے لیے مخفی نہیں ہے۔ کوئی آنکھ ایسی بھی ہے جس کے سامنے مستقبل کا ہر واقعہ اپنی تمام جزئیات سمیت روز روشن کی طرح ظاہر و بیّن ہے۔ یہ ہستی خود ذات جل وعلا کی ہے جس کے سامنے کائنات کا ماضی، حال اور مستقبل کھلی کتاب کی طرح روشن ہیں۔ اپنے وسیع علم اور غیر محدود ادراک کی بنیاد پر وہ یہ

---

[1] لقمان (۳۱: ۳۴)

Marfat.com

جانتا ہے کہ آیندہ زمانے میں کیا ہوگا اور کیا نہیں ہوگا۔ اس کی قدرتوں اور قوتوں کی طرح اس کا علم بھی بے پایاں ہے۔ لیکن جس طرح کسی واقعے کا علم اس کے وقوع کی مجبوری اور قید نہیں بن سکتا، اسی طرح یہ بے پایاں خدائی علم کسی انسان کی مجبوری نہیں ہو سکتا۔[1]

---

[1] مولانا روم نے اس موضوع پر دو بڑی نفیس حکایات پیش کی ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک چور کو شہر کے پیادے پکڑ کر کوتوال کے پاس لائے اور بتایا "کہ اس شخص کو ہم نے چوری کرتے ہوئے موقع پر گرفتار کیا ہے۔ کوتوال نے چور سے پوچھا: تو نے چوری کی ہے؟ اس نے جواب دیا ہاں، لیکن میں نے جو کچھ کیا خدا کے حکم سے کیا۔ تو جانتا ہے کہ کائنات کا ایک ذرہ بھی خدا کے حکم سے باہر نہیں ہے۔ یہ سن کر کوتوال نے پیادوں سے کہا کہ اسے درخت سے اُلٹا لٹکا کر اتنا مارو کہ کھایا پیا سب بھول جائے۔ یہ حکم سن کر چور نے گڑگڑانا اور رونا شروع کر دیا تو کوتوال نے کہا: اب کیوں روتا ہے؟ یہ کام میں بھی خدا کے حکم ہی سے کر رہا ہوں۔

اسی طرح ایک شخص بغیر کسی اجازت کے باغ میں جا گھسا اور درخت پر چڑھ کر پھل توڑنے لگا۔ اتنے میں باغ کا مالک ادھر آنکلا اور اس شخص کو پھل توڑتے دیکھ کر بولا۔ ارے او بے حیا! یہ کیا حرکت ہے؟ پھل توڑنے والے نے جواب دیا اگر اللہ کے باغ سے اللہ کا بندہ اللہ کی پیدا کی ہوئی کھجور توڑ کر کھائے تو اس میں بے حیائی کی کون سی بات ہے؟ خدائے بے نیاز کی لازوال نعمتوں پر سانپ بن کر بیٹھنے والا تو کون ہے؟ یہ سن کر باغ کے مالک نے اپنے نوکر سے کہا: ذرا مضبوط سی رسی اور کوڑا لے آؤ تاکہ میں اللہ کے اس بندے

Marfat.com

خدا تعالیٰ نے اپنی نسبت ارشاد فرمایا:

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ[لہ]

اور اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جن کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

"مفاتح الغیب" کہتے ہیں مخفی حقائق کو۔ مطلب یہ ہے کہ کائنات کے حقائق مخفیہ غیبیہ کا علم خدا کے پاس ہے۔ خدا تعالیٰ کی ذات آفرینش کائنات سے پہلے موجود تھی۔ اس نے انسانوں اور دوسری کائنات کو پیدا کیا اور پھر انسانوں کو اپنے عمل کا مکمل اختیار عطا فرما دیا۔ انسانوں نے اپنے اس اختیار کو بروئے کار لاتے ہوئے مختلف اچھے اور برے کام کیے۔ کسی نے قتل کیا، کسی نے لوٹ مار مچائی، کسی نے بھلائی کی، کسی نے عدل و انصاف کے تقاضے پورے کیے۔ لڑائیاں لڑیں، ملک فتح کیے، زمین کو سنوارا، شہر آباد کیے، چھوٹی بڑی بستیاں آباد کیں۔ ان اعمال کے وقوع پذیر ہونے سے مختلف نتائج پیدا ہوئے۔ خداوند تعالیٰ چونکہ مفاتح الغیب کا مالک ہے، اس لیے انسانوں کو متوقع آزادی دیے جانے کے جو نتائج وقوع پذیر ہونے تھے، وہ اسے پہلے سے معلوم

(بقیہ از صفحہ گزشتہ)

کو جواب دوں۔ غلام دوڑا دوڑا گیا اور دونوں چیزیں پیش کر دیں۔ باغ کے مالک نے چور کو اسی درخت سے باندھا اور اس کی پیٹھ پر کوڑے برسانے شروع کر دیے۔ چور نے کہا: ارے بھائی کچھ تو خدا کا خوف کرو کیا مجھے مار ڈالے گا۔ اس نے جواب دیا جیتے جی مت! اللہ کی پیدا کی ہوئی لکڑی سے اللہ کا ایک بندہ اللہ کے دوسرے بندے کو مار رہا ہے۔ آخر اس چور نے اپنے عقیدے سے توبہ کی اور اقرار کیا کہ بے شک انسان کو قوت اختیار یہ حاصل ہے (حکایات رومی، ص ۱۰۶)

لہ الانعام (۶: ۵۹)

Marfat.com

سمجھتے۔ لیکن خداوند تعالیٰ کا یہ علم کسی شخص کو مجبور نہیں کرتا۔

فی الجملہ کسی امر کا پہلے سے جان لینا، اس کے وقوع کا اندازہ لگا لینا "قدر" ہے اور تخلیق کائنات کا ایک حصہ ہے۔ جبکہ اس کے علم کے اظہار اور اسے بیان کر دینے کا نام "قضا" ہے۔ "قدر" انسانی آزادی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ کیونکہ اس سے انسان کے مختار اور آزاد ہونے پر روشنی پڑتی ہے۔ انسان اور اس کے اعمال و کوائف سے متعلق خدا تعالیٰ کے مقرر کردہ اندازوں کا اظہار ہوتا ہے

قضا مُعلّق اور قضا مُبرم

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ گو خدا تعالیٰ نے انسان کے کسب و عمل کی نسبت پہلے سے اندازہ مقرر فرمالیا ہے اور "قضا" کی صورت میں اس کا اظہار بھی فرما دیا ہے لیکن انسان کا تکمیلِ کار کی آخری گھڑی تک اپنے اس کام کو کرنے یا نہ کرنے کا اختیار باقی رہتا ہے وہ اگر چاہے تو اپنی نیت کو بدل سکتا ہے، اپنے بڑھتے ہوئے قدموں کو روک سکتا ہے اور خدا کی طرف سے بھی یہ وعدہ ہے کہ اگر کوئی بندہ بدلنا چاہے تو ہم اس کے بدلنے والے ارادے اور نیت کے ساتھ ہی اس کی تقدیر بھی بدل دیں گے۔ سورۃ الرعد میں ارشاد فرمایا:

يَمْحُو اللّٰهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهٗ أُمُّ الْكِتَابِ ؎

خدا جس کو چاہتا ہے مٹ دیتا ہے اور (جس کو چاہتا ہے) قائم رکھتا ہے۔ اور لوحِ محفوظ اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

؎ الرعد ۱۳: ۳۹

Marfat.com

ام الکتاب سے مراد "لوحِ محفوظ" ہے۔ جہاں ماکان ومایکون کے احوال اور کیفیات کا اندراج ہوتا ہے جو بقولِ بعض علمِ الٰہی ہی کا نام ہے۔ لہٰذا اس آیۂ مبارکہ میں اعلان کیا گیا ہے کہ خداوند تعالیٰ اپنے انداز سے میں تبدیلی کرتا رہتا ہے اور موقع بہ موقع اس میں ردو بدل کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ یہ عام طور پر "قضا معلق" کی صورت میں ہوتا ہے۔ گویا اگر انسان خود کو بدل لے یا بدلنا چاہے تو خداوند تعالیٰ اس کی خاطر اپنے اندازے اور اپنی مقرر کردہ تقدیر میں تبدیلی فرما دیتا ہے۔

معاذ اللہ خدا کا علم انسان کے اعمال کی نسبت غلط نہیں ہو سکتا۔ تو پھر لکھی ہوئی تقدیر کو مٹانے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اور اگر تقدیر لکھی ہوئی نہ ہو تو اس کو لکھنا کیوں ضروری ہوا؟ بہرحال لکھی ہوئی کو مٹانا اور نہ لکھی ہوئی کا لکھا جانا، یہ دونوں امر اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ تقدیر قطعاً ایسے مسئلے کا نام نہیں جس میں تبدیلی نہ ہو سکے۔ وہ تو محض انسانی اچھائی یا برائی کا ایسا علم ہے جس میں موقع و محل کی نسبت سے تغیر و تبدل ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ انسان اس تبدیلی پر مائل ہو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ملکِ شام میں طاعون کی وبا پھیلی اس زمانے میں حضرت عمر بھی شام گئے ہوئے تھے۔ وبا کی وجہ سے انہوں نے وہاں سے نکلنے میں جلدی کی تو حضرت ابو عبیدہ نے فرمایا:

افر من قضاء اللہ — کیا آپ اللہ کی قضا سے بھاگتے ہیں؟

فرمایا:

افر من قضاء اللہ — میں اللہ کی قضا سے اس کی قدر

Marfat.com

الیٰ قدر اللّٰہ [1] کی طرف بھاگتا ہوں

مطلب یہ ہے کہ قضا تو فیصلے کا صرف اعلان ہے۔ اگر طاعون جیسا مہلک مرض کسی علاقے میں وبا کی صورت میں پھیل جائے اور ہم کسی دوسرے علاقے میں پہنچ کر اس مرض سے بچ جاؤں تو یہ امر بچ جانا یقیناً خدا کی تقدیر یعنی علم میں ہوگا۔ اس لیے فرمایا کہ طاعون کے فیصلے سے ہٹ کر میں خدا کے علم کی طرف جا رہا ہوں۔ کیونکہ قضا ایک امرِ الٰہی ہے مگر تقدیر پر انسان کا اختیار ہے۔ [2]

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد

ایک مرتبہ صحابہ کے ذہنوں میں مسئلہ تقدیر کی نسبت کچھ شکوک و شبہات پیدا ہوئے۔ چنانچہ اُنہوں نے انہی سوالات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اور خیال کرتے ہوئے کہ جو کچھ طے ہو چکا ہے وہ بدل نہیں سکتا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا۔

اَفَلَا نَتَوَکَّلُ — کیا ہم اپنی تقدیر پر بھروسا نہ کرلیں۔

اس پر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

جفّ القلم بما انت لاقٍ [3] — جو کچھ تمہیں ملنے والا ہے اُسے قلم لکھ کر خشک ہو چکے ہیں۔

---

[1] المفردات، الراغب الاصفہانی

[2] تفسیر المفاتیح العلوم للرازی، ۶ : ۵۲۷، مطبوعہ قاہرہ بذیل الاحزاب (سورہ ۳۳، آیت ۳۷، ۳۸) نے یہ الفاظ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف منسوب

(بقیہ آئندہ صفحے پر)

Marfat.com

آپ کے اس ارشاد کا مفہوم یہ ہے کہ خدائی علم اور نوشتۂ تقدیر نے انسان کو مجبور نہیں کر دیا بلکہ انسان کو تگ و دو اور سعی و جد و جہد کے ساتھ اپنے مقدر کو تلاش کرنے کی آزادی دی ہے، اسے عمل کا اختیار دیا ہے، اسے کسب خیر کی تلقین فرمائی ہے۔

ابتدا خطبہ میں ایک حدیث کا تذکرہ کیا گیا تھا جس میں ارشاد تھا کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے قلم کو پیدا فرمایا اور اسے حکم دیا کہ جو کچھ ہو چکا ہے (ما کان) اور جو کچھ ہونے والا ہے (ما یکون) سب کچھ لکھ دے۔ یہاں غور فرمائیے: صرف زمانہ مستقبل کے کوائف قلمبند کرنے کا حکم نہیں دیا جا رہا، بلکہ ماضی کے واقعات بھی قلمبند کرنے کا امر فرمایا۔ اب اگر یہ تقدیری نوشتہ اپنے سے پہلے (ما کان) کے واقعات پر اثر انداز نہیں ہو سکتا تو مستقبل کے حالات (ما یکون) کو کیونکر متاثر کر سکتا ہے۔

اسی طرح ایک موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام کو ایک طویل خطبہ دیا جس کے متعلق حضرت ابو حذیفہ فرمایا کرتے تھے:

قام فینا رسول اللہ	رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک
صلی اللہ علیہ وسلم	مرتبہ لمبا خطبہ دیا جس میں آپ نے اپنے
مقاما ما ترک شیئا	وقت سے لے کر قیامت تک جو کچھ ہونے

(بقیہ از صفحہ گزشتہ)

کیے ہیں اور یہ واقعہ لکھا ہے کہ آپ ایک پہاڑ پر سے گزر رہے تھے وہاں کچھ ایسے پتھر پڑے تھے جو گرنے کو تھے۔ آپ وہاں سے تیزی کے ساتھ گزر گئے۔ اس موقع پر مندرجہ بالا سوال و جواب ہوئے۔ عین ممکن ہے یہ دونوں ہی واقعات پیش آئے ہوں حضرت عمرؓ کو ارشاد نبوی یاد ہو اور انہوں نے اس موقع پر بھی الفاظ دہرا دیے ہوں۔

؎ البخاری ومسلم۔

Marfat.com

یکون فی مقامہ ذالك	والا تھا، سب کا ذکر کیا۔ جس نے یاد
الی قیام الساعۃ الا	رکھا اُس کو یاد رہ گیا اور جس نے بھلا
حدث بہ حفظہ من	دیا، وہ بھول گیا۔
حفظہ ونسیہ من	
نسیہ [1]	

اس قسم کی بہت سی روایات اور احادیث کتب صحاح ستہ میں مروی ہیں، جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے زمانہ مستقبل کی پیشینگوئیاں اور آئندہ زمانے کے واقعات وحالات کا ٹھیک ٹھیک بیان مذکور ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ آپ نے لوگوں کے جنت میں داخل ہونے تک کے تمام وقائع بیان فرما دیئے تھے۔

آپؐ نے اس خطبہ میں قیامت تک کے احوال کو بیان فرمایا ازل میں قلم نے بھی کائنات کے جملہ حقائق کو لوح محفوظ پر رقم کیا تھا۔ اب اگر حضور اکرمؐ کا بیان انسانی زندگی کے لیے جبر نہیں ہے تو نوشتۂ تقدیر انسان کو کیسے مجبور کر سکتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے انسان کی نیکی اور بدی کی ذمہ داری خود اس کے اپنے کندھوں پر ڈالی ہے تاکہ نیکی کی صورت میں جزا کا اور بدی کی صورت میں سزا کا مستحق ہو سکے۔ اسی مضمون کو علامہ اقبال نے کس خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے، فرماتے ہیں:

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے
عبث ہے شکوۂ تقدیر یزداں
تو خود تقدیر یزداں کیوں نہیں ہے

---

[1] بخاری ومسلم۔ بزمشکوٰۃ شریف، ۲: ۱۰۳۰، حدیث ۵۱۴۸۔

Marfat.com

نیز فرمایا :

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے ، بتا تیری رضا کیا ہے

گویا بندے کے لیے خدا کی طرف سے اعلان ہے کہ :

اے انسان ! تو اس کائنات میں تصرف کرنے والی واحد مخلوق تھا ، کائنات کا ایک ایک ذرہ ہم نے تیری غلامی میں دیا تھا تو اگر میری اطاعت اختیار کیے رہتا تو کائنات کا ہر وجود میرے سامنے سرنگوں اور سربسجود رہتا ۔ اے انسان ! تو اس کائنات میں خدا تعالیٰ کی محبت اور اطاعت کے ذریعے اس کا مقبول بندہ بننے آیا تھا لیکن تجھے کس نے گمراہ کردیا ۔ تو نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ میرے تقدیری فیصلوں نے تجھے مجبور اور پابند بنا دیا ہے ؟ تجھے قرآن و حدیث کی صورت میں ٹھیک ٹھیک کھلی اور روشن ہدایات دی گئی تھیں ۔ تجھے بتا دیا گیا تھا کہ تو اپنے افعال میں مجبور اور مقید نہیں ہے ۔ بلکہ اپنے افعال اور اپنے اعمال پر پورا پورا اختیار رکھتا ہے ۔ اسی اختیار کی بنیاد پر تجھے تیری نیکی کا صلہ ملے گا اور برائی کی سزا دی جائے گی لیکن دنیا اور اس کی اندھی ہوس نے تیری آنکھوں پر پٹی باندھ دی اور تو اپنی خواہش کا غلام بن کر رہ گیا ۔ تو اس کی ذمہ داری قبول کرنے کے بجائے مسئلہ تقدیر پر ڈالتا رہا ۔ قیامت کے روز تیرا کوئی عذر مسموع نہ ہوگا ۔ اور تجھے اپنے کیے کی پوری پوری سزا مل کر رہے گی ۔

Marfat.com

Marfat.com

خطبات سیاسیات و دروس تصوف زیر ترتیب و تدوین

پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی چند معرکۃ الآرا تصانیف

تفسیر منہاج القرآن زیر تالیف

1. تسمیۃ القرآن (تفسیر بسم اللہ الرحمن الرحیم)
2. سورہ فاتحہ اور تعمیر شخصیت
3. اسلامی فلسفہ زندگی
4. اجزائے ایمان (مکمل)
5. ایمان اور اسلام
6. مناہج العرفان فی لفظ القرآن
7. فرقہ پرستی کا خاتمہ کیونکر ممکن ہے؟
8. حقیقت توحید و رسالت
9. بلاسود بنکاری (عبوری خاکہ)
10. قرآن اور شمائل نبوی صلی اللہ علیہ وسلم
11. منافقت اور اس کی علامات
12. اسلامی اور مغربی تصور قانون کا تقابلی جائزہ
13. سیاسی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل
14. معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل
15. اجتہاد اور اس کا دائرہ کار
16. شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور فلسفہ خودی
17. شہادت توحید
18. معارف اسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم
19. تاریخ فقہ میں ہدایہ اور صاحب ہدایہ کا مقام
20. اقبال اور تصور عشق
21. تحقیق مسائل کا شرعی اسلوب
22. فلسفہ تسمیہ (تفسیر بسم اللہ الرحمن الرحیم)
23. حکمت استعاذہ (تفسیر اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم)
24. معارف اسم اللہ
25. صفت رحمت کا شان امتیاز
26. علم — توجیہی یا تخلیقی
27. دینی اور لادینی علوم کے اصلاح طلب پہلو
28. ہمارا دینی زوال اور اس کے تدارک کا سہ جہتی منہاج
29. عصر حاضر اور فلسفہ جہاد
30. حصول مقصد کی جدوجہد اور نتیجہ خیزی
31. پیغمبرانہ جدوجہد اور اس کے نتائج
32. قرآنی فلسفہ تبلیغ
33. فطرت کا قرآنی تصور
34. قرآنی فلسفہ عروج و زوال
35. پیغمبر انقلاب اور صحیفہ انقلاب
36. عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم وقت کی اہم ضرورت
37. نص اور تعبیر نص
38. حضور صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت مصلح سیاست
39. حضرت مولانا شاہ احمد رضا خاں کا علمی مقام
40. طاغوتی یلغار کے چار محاذ
41. رب العالمین (لفظ رب کے معانی و معارف)
42. لا اکراہ فی الدین کا قرآنی فلسفہ
43. ہم اپنا اصل وطن بھول چکے ہیں
44. خشیت الٰہی اور اس کے تقاضے
45. جشن میلاد النبی کی شرعی حیثیت
46. فساد قلب اور اس کا علاج
47. غلامی رسول — حقیقی تقویٰ کی اساس
48. عشق رسول استحکام ایمان کا واحد ذریعہ
49. منہاج الافکار
50. محبت الٰہی اور اس کے تقاضے
51. عقیدہ ختم نبوت اور مرزا غلام احمد قادیانی
52. نظام مصطفیٰ — ایک ایمان افروز اصطلاح
53. ارکان اسلام مکمل
54. فلسفہ نماز
55. فلسفہ حج
56. فلسفہ روزہ
57. فلسفہ زکوٰۃ
58. خطبات لاہور (زیر طبع)
59. حقیقت تصوف
60. گستاخ رسول کی سزا
61. ایمان بالقدر
62. ایمان بالرسالت
63. ایمان بالکتب
64. ایمان بالآخرت

1. Islamic Philosophy of Human Life
2. Islam in Various Perspectives
3. Islam and Christianity
4. Islam & Criminality
5. Legal Character Of Islamic Punishments
6. Legal Structure Of Islamic Punishments
7. Classification Of Islamic Punishments
8. Islam and Freedom of Human Will
9. Quranic Basis of Constitutional Theor;
10. Islamic Philosophy of Punishments
11. Islamic Concept of Law
12. Islamic Concept of Benevolence
13. Quranic Concept of Human Guidance
14. Islamic Concept of Human Nature
15. Islamic Concept of Crime
16. Philosophy of Ijtihad and The Modern World
17. Divine Pleasure (The Ultimate Ideal)
18. Islam-The State Religion
19. Belief in Prophethood (U.P.)
20. CREATION OF MAN A review of Qur'an and Science (U.P.)
21. CREATION OF UNIVERSE A review of Qur'an and Science (U.P.)

اس کے علاوہ دیگر موضوعات پر پروفیسر صاحب کے ۲۰۰ مسودات ترتیب و طباعت کے مراحل میں ہیں

ملنے کا پتہ ○ مرکزی سیکرٹریٹ ادارہ منہاج القرآن ۳۶۵ ایم ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون: ۸۹۷۱۲۲ ○ ضیاء القرآن پبلی کیشنز گنج بخش روڈ لاہور۔ فون: ۶۳۲۴۹۱ ○ اے ون پلومر بالمقابل ہائی کورٹ شاہراہ قائد اعظم لاہور فون: ۵۲۰۹۶ ○ ادارہ منہاج القرآن المالک پلازہ B/6 نزد جہانگیر پارک ایمپریس مارکیٹ صدر کراچی فون: ۷۱۴۴۳۹ ○ ادارہ منہاج القرآن ۲۷۔ بی المرکز جی۔۹ اسلام آباد فون: ۵-۸۱۲۷۹۳ EXT ۲۱۴

Marfat.com

خطبات سیاسیات و دروس تصوف زیر ترتیب و تدوین	پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی چند معرکۃ الآرا	تفسیر منہاج القرآن زیر تالیف

تصانیف

(۱) تسمیۃ القرآن (تفسیر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم)
(۲) سورہ فاتحہ اور تعمیر شخصیت
(۳) اسلامی فلسفہ زندگی
(۴) اجزائے ایمان (مکمل)
(۵) ایمان اور اسلام
(۶) منہاج العرفان فی لفظ القرآن
(۷) فرقہ پرستی کا خاتمہ کیونکر ممکن ہے؟
(۸) حقیقت توحید و رسالت
(۹) بلاسود بنکاری (عبوری خاکہ)
(۱۰) قرآن اور شمائل نبوی صلی اللہ علیہ وسلم
(۱۱) منافقت اور اس کی علامات
(۱۲) اسلامی اور مغربی تصور قانون کا تقابلی جائزہ
(۱۳) سیاسی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل
(۱۴) معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل
(۱۵) اجتہاد اور اس کا دائرہ کار
(۱۶) شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور فلسفہ خودی
(۱۷) شہادت توحید
(۱۸) معارف اسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم
(۱۹) تاریخ فقہ میں ہدایہ اور صاحب ہدایہ کا مقام
(۲۰) اقبال اور تصور عشق
(۲۱) تحقیق مسائل کا شرعی اسلوب
(۲۲) فلسفہ تسمیہ (تفسیر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم)
(۲۳) حکمت استعاذہ (تفسیر اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم)
(۲۴) معارف اسم اللہ
(۲۵) صفت رحمت کا شان امتیاز
(۲۶) علم — توجیہی یا تخلیقی
(۲۷) دینی اور لادینی علوم کے اصلاح طلب پہلو
(۲۸) ہمارا دینی زوال اور اس کے تدارک کا سہ جہتی منہاج
(۲۹) عصر حاضر اور فلسفہ جہاد
(۳۰) حصول مقصد کی جدوجہد اور نتیجہ خیزی
(۳۱) پیغمبرانہ جدوجہد اور اس کے نتائج
(۳۲) قرآنی فلسفہ تبلیغ
(۳۳) فطرت کا قرآنی تصور
(۳۴) قرآنی فلسفہ عروج و زوال
(۳۵) پیغمبر انقلاب اور صحیفہ انقلاب
(۳۶) عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم وقت کی اہم ضرورت
(۳۷) نفس اور تعبیر نفس
(۳۸) حضور صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت مصلح سیاست
(۳۹) حضرت مولانا شاہ احمد رضا خاں کا علمی مقام
(۴۰) طاغوتی یلغار کے چار محاذ
(۴۱) رب العالمین (لفظ رب کے معانی و معارف)
(۴۲) لا اکراہ فی الدین کا قرآنی فلسفہ
(۴۳) ہم اپنا اصل وطن بھول چکے ہیں
(۴۴) خشیت الٰہی اور اس کے تقاضے
(۴۵) جشن میلاد النبی کی شرعی حیثیت
(۴۶) فساد قلب اور اس کا علاج
(۴۷) غلامی رسول — حقیقی تقویٰ کی اساس
(۴۸) عشق رسول استحکام ایمان کا واحد ذریعہ
(۴۹) منہاج الافکار
(۵۰) محبت الٰہی اور اس کے تقاضے
(۵۱) عقیدہ ختم نبوت اور مرزا غلام احمد قادیانی
(۵۲) نظام مصطفیٰ — ایک ایمان افروز اصطلاح
(۵۳) ارکان اسلام مکمل
(۵۴) فلسفہ نماز
(۵۵) فلسفہ حج
(۵۶) فلسفہ روزہ
(۵۷) فلسفہ زکوٰۃ
(۵۸) خطبات لاہور (زیر طبع)
(۵۹) حقیقت تصوف
(۶۰) گستاخ رسول کی سزا
(۶۱) ایمان بالقدر
(۶۲) ایمان بالرسالت
(۶۳) ایمان بالکتب
(۶۴) ایمان بالآخرت

1- Islamic Philosophy of Human Life
2- Islam in Various Perspectives
3- Islam and Christianity
4- Islam & Criminality
5- Legal Character Of Islamic Punishments
6- Legal Structure Of Islamic Punishments
7- Classification Of Islamic Punishments
8- Islam and Freedom of Human Will
9 Quranic Basis of Constitutional Theor,
10- Islamic Philosophy of Punishments
11 Islamic Concept of Law
12. Islamic Concept of Benevolence
13. Quranic Concept of Human Guidance
14 - Islamic Concept of Human Nature
15 - Islamic Concept of Crime
16. Philosophy of Ijtihad and The Modern World
17 - Divine Pleasure (The Ultimate Ideal)
18 - Islam-The State Religion
19 - Belief in Prophethood (U.P.)
20 . CREATION OF MAN A review of Qur'an and Science (U.P.)
21 . CREATION OF UNIVERSE A review of Qur'an and Science (U.P.)

اس کے علاوہ دیگر موضوعات پر پروفیسر صاحب کے ۲۰۰ مسودات ترتیب و طباعت کے مراحل میں ہیں

ملنے کا پتہ ○ مرکزی سیکرٹریٹ ادارہ منہاج القرآن ۳۶۵ ایم ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون: ۸۶۷۱۲۲ ○ ضیاء القرآن پبلی کیشنز گنج بخش روڈ لاہور۔ فون: ۶۳۴۴۹۱
○ ای پلومر بالمقابل ہائی کورٹ شاہراہ قائداعظم لاہور فون: ۵۲۰۹۶۱ ○ ادارہ منہاج القرآن المالک پلازہ B/6 نزد جہانگیر پارک ایمپریس مارکیٹ صدر
کراچی فون: ۷۱۴۴۳۹ ○ ادارہ منہاج القرآن ۲۷۔ بی المرکز جی۔۹ اسلام آباد فون: ۵۱-۸۱۲۷۹۳ EXT ۲۱۴

Marfat.com